قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

بدل اشتراک سالانہ پاکستان -/۴۸ روپے غیر ممالک -/۹۸ روپے	ٹیلیفون ۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	قیمت فی پرچہ ۴ چار روپے
جلد ۳۷	فروری ۱۹۸۴ء	شمارہ ۲

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ —— لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون ۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	بدل اشتراک سالانہ پاکستان -/۴۸ روپے غیر ممالک -/۹۸ روپے
۴ چار روپے		
شمارہ ۲	فروری ۱۹۸۴ء	جلد ۳۷

فہرست

- لمعات (سیاسی پارٹیاں) —— ۲
- حقائق و عبر: یاسر عرفات۔ زندہ کرامت۔ دوسری اسلامی مملکت۔ اقتدار سنبھالئے پیاز ۵
- کیا عین تھا یہ خواب؟ (محترم پرویز صاحب) ۹
- نقد و نظر —— (جوہر تقویم) —— ۳۲
- منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے! —— ۴۳
- —— یوم پیدائش قائدِ اعظمؒ پر محترم پرویز صاحب کا خطاب ——
- باب المراسلات: عورت کی شہادت۔ خلافِ اسلام قوانین۔ غلام پختہ کار ہے شعور ۵۳
- —— مولانا عبد الستار نیازی کا آئین نادرلا۔ اسلامی انقلاب کا سیاسی طریق۔ لاہور ٹیلی ویژن کا ڈرامہ
- فہرست مطبوعات ادارہ طلوعِ اسلام —— ۶۲

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: شیخ عبد الحمید۔ مقام اشاعت: ۲۵-بی گلبرگ نمبر ۲ لاہور۔ مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۹۔ ایبک روڈ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

لمعات

قرآن کریم نے انسانوں کی تمدنی اور اجتماعی زندگی کے لئے جو انقلاب آفریں اصول متعین فرمائے ان میں سرِ فہرست تشکیلِ قومیت (امت) کا معیار تھا۔ اس نے کہا کہ جو لوگ ایک ضابطۂ قوانین کی اطاعت کرتے ہیں وہ ایک قوم کے افراد ہوتے ہیں۔ اس معیار کی رو سے (اس نے کہا کہ) جو لوگ کتاب اللہ (قرآن مجید) کی اطاعت کریں گے وہ امتِ مسلمہ کے افراد کہلائیں گے۔ اگر کسی نے اس کی جگہ کسی اور ضابطۂ قوانین کی اطاعت اختیار کر لی، یا اس کے ساتھ دیگر قوانین ملا لئے تو وہ اس امت سے الگ ہو جائے گا۔ (الگ ہو جانے کو تفرقہ یا فرقہ بندی کہتے ہیں)۔ اس نے تشکیلِ امت کے اس بنیادی اصول کو چار لفظوں میں بیان کر دیا جب کہا کہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا... (۳/۱۰۳) "تم سب مل کر، اجتماعی طور پر سب کے سب خدا کی کتاب کے ساتھ متمسک رہو اور تفرقہ پیدا نہ کرو"۔ اگر تم نے کتاب اللہ کو اپنی اطاعت کا مرکز قرار دے لیا تو تم بہترین قوم (خیرِ امت ۳/۱۱۰) بن جاؤ گے۔ اگر تفرقہ پیدا کر لیا تو جہنم میں پہنچ جاؤ گے۔ (۳/۱۰۳) یہ تھا قرآن کی رو سے، تشکیلِ امت یا جامعیت کا بنیادی اصول۔ جب تک امت اس اصول پر قائم رہی، وہ امتِ واحدہ رہی۔ جب اس نے اپنی اطاعت کے لئے دیگر مراکز اختیار کر لئے تو وہ فرقوں میں بٹ گئی۔ اس نہج زندگی کو قرآن نے مشرکین کا انداز زیست قرار دیا (۳۰/۳۲) اور رسول اللہ سے فرما دیا کہ تمہارا ان لوگوں سے کچھ واسطہ نہیں رہے گا (۶/۱۵۹)۔ صدیوں سے مسلمان فرقوں میں بٹے چلے آ رہے تھے اور قرآن مجید کی ان آیات سے آنکھیں بند کر کے آگے بڑھے جاتے تھے، تا آنکہ علامہ اقبالؒ نے یہ تجویز کیا کہ ایک ایسی مملکت قائم کی جائے جس میں اطاعت صرف قرآن کے ضابطۂ قوانین کی ہو تا کہ (اس طرح) فرقے مٹ جائیں اور (ابتداءً محدود پیمانے پر ہی سہی) امتِ واحدہ پھر سے وجود میں آ جائے۔ پاکستان اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔

تشکیلِ پاکستان کے وقت علامہ اقبالؒ ہم میں موجود نہ تھے۔ طلوعِ اسلام نے اپنا فریضہ قرار دیا کہ وہ بتائے کہ فرقہ بندی کس طرح اسلام کے خلاف ہے اور پاکستان کا مقصود کتاب اللہ کو مرکزِ اطاعت قرار دے کر، فرقوں کی جگہ امتِ واحدہ کی تشکیل ہے۔ طلوعِ اسلام نے اس حقیقت کو قرآن مجید کی نصوصِ صریحہ کی روشنی میں اس شد و مد اور اصرار و تکرار سے

واضح کیا کہ لوگوں نے علماء حضرات سے پوچھنا شروع کر دیا کہ ان آیاتِ قرآنی کی موجودگی میں فرقوں کا وجود کسطرح باقی رہ سکتا ہے۔ ان کے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہ تھا اور امید کی جاسکتی تھی کہ وہ (زچ آکر ہی سہی) اعترافِ حقیقت پہ مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن (قرآن نے جو کہا ہے کہ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ۔۔ (۱۶/۶۳) شیطان لوگوں کے غلط کاموں کو خوشنما بنا کر دکھا دیا کرتا ہے) کسی نے ان کے کان میں یہ افسوں پھونک دیا کہ یہ فرقے ہیں ہی نہیں "مکاتبِ فکر" ہیں۔ اس لئے تم گھبراؤ نہیں۔ اپنی روش پہ چلے جاؤ۔ اسطرح، ایک لفظ کی تبدیلی سے، کفر کو اسلام اور شرک کو توحید بنا دیا، اور وہ جو فرقہ بندی کے خلافِ اسلام ہونے کے احساس سے کبھی دل میں خلش پیدا ہونے کا امکان تھا، وہ بھی نہ رہا اور یہ حضرات (كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۲) کے قرآنی ارشاد کے مطابق) اپنی اپنی خلافِ اسلام روش پہ مطمئن ہو کر چلتے رہے۔ اسطرح پاکستان کا، اختلاف و افتراق ختم کرنے کا پروگرام قدمِ اوّل ہی میں نسیاً منسیاً ہو گیا۔ نہ صرف نسیاً منسیاً ہو گیا بلکہ قرآنی قوانین کی جگہ فقہی قوانین کو بطور قوانینِ مملکت نافذ کرنے سے، فرقوں کی جڑیں اور بھی مضبوط ہو گئیں۔

مذہب سے ہٹ کر اب سیاست کی طرف آیئے۔ پاکستان میں (برائے نام کالعدم) جماعتِ اسلامی سب سے زیادہ مؤثر اور منظم سیاسی جماعت ہے کیونکہ پراپیگنڈہ کے وسیع وکثیر ذرائع اس کی تحویل میں ہیں۔ ان کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ جس بات کی یہ مخالف ہو اسے خلافِ اسلام قرار دے کر سارے ملک میں شور مچا دیتی ہے۔ جو اس کی مصلحت کے مطابق ہو اسے عین مطابقِ اسلام قرار دے کر اس کے حق میں پراپیگنڈہ شروع کر دیتی ہے۔ آئندہ (مجوزہ) انتخابات کے سلسلہ میں یہ سوال سامنے آیا کہ وہ جماعتی بنیادوں پہ ہوں یا غیر جماعتی بنیادوں پہ۔ (قوم کی بدقسمتی سے) جماعتِ اسلامی کی مصلحت کا تقاضا تھا کہ انتخابات جماعتی بنیادوں پہ ہوں۔ لہٰذا انہوں نے سیاسی پارٹیوں کو مطابقِ اسلام قرار دے کر ان کے حق میں حسبِ معمول پراپیگنڈہ شروع کر دیا۔ حالانکہ سیاسی پارٹیاں مذہبی فرقوں سے کم تفرقہ کا موجب نہیں ہوتیں۔ چنانچہ فضا اس وقت اس سے معمور ہو رہی ہے۔ اگر یہ حضرات، غیر جماعتی بنیادوں پہ انتخابات کے حق میں ہوتے، تو سیاسی پارٹیاں خلافِ اسلام قرار دے دی جاتیں۔ یہ محض مفروضہ نہیں۔ مبنی بر حقیقت ہے۔ جب (مرحوم) مودودی صاحب حیدر آباد (دکن) سے پنجاب کی طرف تشریف لائے تھے تو ان کی اپنی کوئی پارٹی نہیں تھی اور ملک میں مسلمانوں کی دیگر پارٹیاں موجود تھیں۔ انہوں نے فیصلہ صادر فرما دیا کہ اسلام میں سیاسی پارٹیاں بنانا جائز نہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ:-

> مسلمان قوم تو پہلے ہی سے ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی، یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا، اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں

میں تقسیم کرکے ان کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا، یہ در اصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں، تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کرکے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہلِ مغرب سے لئے ہیں۔ (سیاسی کشمکش حصہ اوّل صہ۵)

اس کے بعد جب انہوں نے خود اپنی پارٹی بنائی تو پارٹی سازی عین مطابق اسلام قرار پا گئی۔ اسی لئے ہم نے کہا ہے کہ اگر (کالعدم) جماعتِ اسلامی غیر جماعتی الیکشن میں اپنا مفاد دیکھتی تو سیاسی پارٹیاں خلافِ اسلام قرار پا جاتیں۔ ان کا اسلام، ان کی مصلحتوں کے تابع رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو جسقدر نقصان ان حضرات نے پہنچایا ہے اس کی مثال کم ہی کہیں اور ملے گی۔ سیاسی پارٹیوں کے شرعی جواز کے سلسلہ میں ان حضرات کی طرف سے پیش کردہ دلائل کا ہم جائزہ لیتے چلے آئے ہیں۔ (بالخصوص ملاحظہ ہو طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۸۳ء) لیکن حال ہی میں ان کی طرف سے جو دلائل دیئے گئے ہیں وہ جہالت کی تمام حدیں پھاند گئے ہیں۔ انصاری کمیشن نے غیر جماعتی انتخابات کے حق میں سفارش کی۔ اس کی مخالفت میں ہفت وار ایشیا بابت ۱۵ جنوری ۱۹۸۴ء میں مولانا سید محمد ناظم ندوی صاحب کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا آغاز اسطرح ہوتا ہے۔

"جس دین میں اجتماعیت کی اس قدر اہمیت ہو، یَدُ اللّٰہِ علی الجماعت کا اعلان کیا گیا ہو اور علیکم بالجماعت کا حکم ہو، جس دین میں عبادت بھی جماعت کے ساتھ یعنی اجتماعی طور پہ ادا کرنے کی تاکید ہو، ایک امام کے پیچھے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی غیر معمولی فضیلت بیان کی گئی ہو اور نماز باجماعت کا ثواب انفرادی طور پہ ادا کرنے کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہو۔ فریضۂ حج بھی ایک امیرِ حج کے تحت ادا کرنے کا حکومتی انتظام و اہتمام ہو، اس دین کے نام پہ قائم ہونے والے ایک ملک میں ایک ایسے کمیشن کی، جس میں سرکاری ملازمین کے ساتھ علماء و مدرسین بھی اس کے ممبران ہوں، غیر جماعتی بنیاد پہ انتخاب کرانے کی سفارش، باعثِ صد حیرت ہے۔"

صاحب مقالہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکے کہ جو دلائل انہوں نے دیئے ہیں وہ خود ان کے خلاف جاتے ہیں۔

(۱) ایک امام کے پیچھے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی غیر معمولی فضیلت۔ تمام نمازیوں کی ایک جماعت اور ان کا ایک امام۔ کیا اس سے وحدتِ امت کا ثبوت ملتا ہے یا مختلف پارٹیوں کا؟

(۲) فریضۂ حج بھی ایک امیرِ حج کے تحت ادا کرنے کا حکم۔ کیا اس سے اجتماعی وحدت کا ثبوت ملتا ہے یا مختلف پارٹیوں کا۔ کیا حج میں امت کا ایک ہی اجتماع ہوتا ہے یا مختلف پارٹیوں کے الگ الگ اجتماعات!

(۳) مقالہ نگار نے دو احادیث بھی نقل کی ہیں۔ یَدُ اللّٰہِ علی الجماعت۔ اور علیکم بالجماعت۔ ان دونوں میں "جماعت" کا صیغہ واحد ہے۔ اور (اَل) نے اس میں خصوصیت پیدا کردی ہے۔ اس کے معنی ہیں — خاص ایک جماعت۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ ایک جماعت (امت)

باقی صفحہ نمبر (۸) پہ ملاحظہ فرمائیں

حقائق و عبر

(۱) بتکدے میں برہمن کی پختہ زُنّاری بھی دیکھ !

ہم سمجھتے ہیں کہ اس دَور کا سب سے بڑا الم انگیز اور جگر سوز واقعہ آزادیٔ فلسطین کے مردِ آہن یاسر عرفات کی جلاوطنی ہے ــــــ بالخصوص وہ خوننابہ فشاں حالات جن میں وہ عمل میں آئی۔ خود اپنوں کی سازش اور بغاوت سے وہ ملک چھوڑنے پہ مجبور ہو گیا لیکن (ہماری روایت کے مطابق، مغضوب علیہ قوم) اسرائیل نے اعلان کیا کہ وہ اسے زندہ وطن نہیں چھوڑنے دیگی۔ دشمنوں کے شکنجہ میں جکڑا ہوا یاسر، ساری دنیا کو مدد کے لئے پکارتا رہا۔ اُمّتِ مسلمہ کی چالیس سے زیادہ آزاد مملکتیں اور ایک ارب سے زیادہ مسلمان باشندے، اس کی اس الغیاث کو سنتے رہے اور کہیں سے لبیک کی آواز سنائی نہ دی۔ آواز بلند ہوئی تو غیر مسلموں کی طرف سے۔ یونان نے سفر کے لئے اپنے جہاز بھیجے۔ فرانس نے حفاظتی سامان بھیجا گیا۔ صلیبِ احمر نے اپنے جھنڈوں کے پر پھیلائے جن کے سائے تلے اُسے رُستگاری نصیب ہوئی۔

اس درد انگیز واقعہ کے ساتھ ہی ایک اور خبر بھی اخبارات میں شائع ہوئی۔ اسرائیل کے چھ جنگی قیدی فلسطینیوں کے زیرِ حراست تھے۔ انہوں نے قریب پانچ ہزار فلسطینی اور لبنانی قیدی رہا کر کے اپنے چھ قیدی چھڑا لئے۔ یہ ہوتی ہے "اپنوں" کی قدر و قیمت۔ اقبالؒ نے بہت پہلے ہلالِ عید کو مخاطب کر کے کہا تھا:-

دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ ۔۔۔ بتکدے میں برہمن کی پختہ زُنّاری بھی دیکھ
کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر ۔۔۔ اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ

اقبالؒ آج زندہ ہوتا تو نہ معلوم مسلمانوں کی کافرماجرائی کو دیکھ کر کس قدر خون کے آنسو بہاتا!

---

۲. زندہ کرامت

اٹلی کا ایک سترہ سالہ نوجوان ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جس چیز کی طرف دیکھتا ہے اس میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں۔ ڈاکٹر اور ماہر سائنسدان اس کی کچھ وجہ دریافت نہیں

کر سکے۔ وہ کہتا ہے کہ اس سے اس کی زندگی ضیق میں آ گئی ہے۔

(جنگ لاہور۔ ۲۰ نومبر ۱۹۸۳ء)

اس نوجوان کی بدقسمتی ہے کہ وہ یورپ میں پیدا ہو گیا۔ ہمارے ہاں ہوتا تو اس کی پرستش ہونے لگ جاتی۔ وہ کبھی کا "حضرت جی" بن گیا ہوتا۔ اس سے بڑی زندہ کرامت اور کیا ہو سکتی ہے؟

۴۔ شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی

پاکستان میں سال ۱۹۸۳ء کا سب سے بڑا ناقابلِ فراموش واقعہ "پیازی المیہ" قرار پائے گا۔ اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کے مطابق "پاکستان نے گزشتہ ڈیڑھ سال کے دوران، دس کروڑ مالیت کا اسّی ہزار ٹن پیاز برآمد کیا۔ یہ بات پیاز کی گرانی اور قلت کا پتہ چلانے کے لئے کئے گئے ایک سروے کے مطابق ہے"۔ (جنگ لاہور مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۸۳ء)۔ اس سے پیاز کی قلت ہو گئی تو جن لوگوں کے پاس اس کا ذخیرہ تھا ان کی چاندی ہو گئی۔ اس کی قیمت پندرہ سولہ روپے کلو تک چڑھ گئی (اس "غریب" نے عمر بھر اس اوجِ طالع کا خواب تک بھی نہ دیکھا ہو گا)۔ اس سے ملک میں شور برپا ہوا تو حکومت نے بھاگ دوڑ کر کے، ادھر ادھر سے پیاز درآمد کیا۔ اس میں بھارت سے درآمد شدہ پیاز کی مقدار کافی تھی۔ لیکن ایسا کرتے وقت حکومت کو یہ یاد نہ رہا کہ ہماری مملکت اسلامی ہے اور یہاں اسلامی نظام رائج ہے۔ اس کی یاد دہانی، پشاور کے ایک ممتاز عالمِ دین کے حسبِ ذیل فتویٰ نے کرائی جو راولپنڈی کے اخبار جنگ کی ۱۲ دسمبر ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے، ملاحظہ فرمایئے:۔

> پشاور (نمائندہ جنگ) جمعیت علمائے اسلام کے راہنما اور ممتاز عالمِ دین مولانا محمد امیر بجلی گھر نے کہا ہے کہ بھٹو مرحوم کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے بلا سوچے سمجھے ایک ایسے صحافی اور عالم کو وزارت کے منصب پر مامور کیا تھا جن میں اس منصب کی اہلیت نہیں تھی۔ وہ گزشتہ رات انجمن تبلیغ قرآن و سنّت، پشاور کے زیرِ اہتمام عید میلاد النبیؐ کے سلسلے میں چوک نقشہ خوانی میں منعقدہ ایک جلسہ سے خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے حکومت کی جانب سے حال ہی میں بھارت سے منگوائے جانے والے پیاز کو بھی ناپاک قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ پیاز جو ہندوؤں کے ہاتھ سے پیدا ہو کر ہمارے پاس پہنچا، مسلمانوں کے لئے قابلِ استعمال نہیں ہے۔ مولانا بجلی گھر نے پشاور میں جگہ جگہ قائم میوزک سینٹروں کی بندش کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ جب ملک میں اسلامی

نظام کی آمد متوقع ہے وہاں میوزک سینٹروں کی بہتات مسلمانوں کے لئے کسی طور قابل برداشت نہیں ہوگی۔

لیکن یہ بات پیاز تک ہی تو محدود نہیں رہ سکتی۔ سوال یہ ہے کہ دنیا بھر کی ادویات اور دیگر مصنوعات جو کافروں کے ملکوں سے پاکستان میں آتی ہیں، ان کے متعلق شریعتِ حقّہ کا کیا حکم ہے؟ کیا اسلامی نظریاتی کونسل۔ یا وفاقی شرعی عدالت اس طرف توجہ فرمائے گی، تاکہ مسلمان بیچارہ لاعلمی میں حرام نہ کھاتا رہے، اور اسے بعد میں "نظریہ ضرورت" کے تحت حلال کی فہرست میں لانا پڑے۔

۴۔ دوسری اسلامی مملکت

صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے علماء کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

پاکستان دوسری اسلامی مملکت ہے پہلی اسلامی مملکت حضور نبی کریمؐ نے چودہ سو سال پہلے، مدینہ منورہ میں قائم فرمائی تھی۔

(نوائے وقت و جنگ مورخہ ۲ جنوری ۱۹۸۴ء)

اس انکشاف سے (کم از کم) ایک فائدہ ضرور ہوا۔ حضور نبی اکرمؐ نے جو اسلامی مملکت قائم فرمائی تھی وہ مثالی، منفرد اور عدیم النظیر تھی۔ لیکن ہماری تاریخ میں اس کی جزئیات اس طرح متعین اور مفصل طور پر نہیں ملتیں کہ ان کے یکجا کرنے سے اس کی ہوبہو، مکمل شکل سامنے آجائے۔ اس کے نمایاں خط و خال ہی سامنے آتے ہیں۔ اب جو صدرِ مملکت نے پاکستان کو دوسری اسلامی مملکت قرار دیا تو اس سے یہ واضح ہوگیا کہ وہ پہلی اسلامی مملکت کس قسم کی تھی! اب ہمیں صحیح اسلامی مملکت کے متعین طور پر سمجھنے کے لئے چودہ سو سال پیچھے نہیں جانا پڑے گا۔ اس کا ماڈل ہمارے اپنے ہاں موجود ہے۔

۵۔ آئیے، اقتدار سنبھالئے!

اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین، مسٹر جسٹس تنزیل الرحمٰن نے علماء کنونشن کو بتایا کہ انہوں نے کس قدر اور کس قسم کی سفارشات حکومت کو پیش کی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی گلہ کیا کہ "اس مقصد کے لئے عملی اقدامات نہ ہونے سے مسلمانوں میں بے چینی پائی جاتی ہے"!

(نوائے وقت ۲، جنوری ۱۹۸۴ء)

اس کے بعد اسی اخبار میں شائع شدہ حسب ذیل خبر قابلِ ملاحظہ ہے:۔

صدر ضیاء الحق نے آج اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کو پیشکش

کی کہ وہ دس روز تک اقتدار سنبھال لیں اور نفاذِ اسلام کے سلسلہ میں اپنی تیار کردہ سفارشات پر عمل کرا کے دکھائیں۔ انہوں نے علماء کنونشن کی آخری نشست سے خطاب کرتے ہوئے، ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کے اس اعتراض کا حوالہ دیا کہ کونسل کی سفارشات پر حکومت نے عمل نہیں کیا۔ صدر نے کہا میں نے ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کو پہلے بھی تجویز پیش کی تھی کہ تین دن کے لیئے حکومت سنبھال لیں، میں ان کی حفاظت کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ یہ پیشکش اب دس دن تک کر دی گئی ہے۔ وہ اپنی سفارشات پر عمل کر کے دیکھیں۔ صدر نے کہا، دراصل جس کا بوجھ ہوتا ہے وہی جانتا ہے کہ بوجھ کسطرح اٹھانا ہے۔

معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب نے اس کا کیا جواب دیا؟

(بقیہ لمعات ملاحظہ فرمائیں)

ہے جیسے نبی اکرمؐ نے متشکل فرمایا تھا۔ اسی کے سر پر اللہ کا ہاتھ تھا اور اس کے ساتھ تمسک امت کا فریضہ۔ اس جماعت کے متعلق حضورؐ نے فرمایا تھا کہ: من فارق الجماعت فمات میتتہً الجاہلیۃ۔ جو اس جماعت (امت) سے الگ ہوا، وہ جاہلیت کی غیر اسلامی موت مرا۔ کیا صاحب مضمون فرمائیں گے کہ وہ کون سی سیاسی پارٹی ہوگی جس سے الگ ہونے پر ایسی سخت وعید سنائی گئی ہے! غالباً وہ جماعتِ اسلامی ہوگی! "جماعات" (جمع کے صیغے میں) کہیں بھی نہیں آیا یہ ہیں ان کی طرف سے پیش کردہ دلائل! یاد رکھئے جب کبھی کسی جگہ اسلامی مملکت قائم ہوگی اس میں بسنے والے تمام مسلمان ایک امت کے افراد ہوں گے، اس میں کوئی ایسا نظریہ، تصور، عقیدہ، مسلک جس سے امت میں تفرقہ پیدا ہو، بار نہیں پا سکے گا۔ اس میں نہ مذہبی فرقوں کا وجود ہوگا نہ سیاسی پارٹیوں کا۔ یہ اس لئے کہ وہ سب ایک ضابطۂ قوانین (قرآن) کی اطاعت کریں گے۔ یہی اعتصام بحبل اللہ کی عملی شکل ہوگی۔

آخر میں ہم پھر دہرا دیں کہ پاکستان ہنوز اسلامی مملکت نہیں بن سکا۔ اس لئے اس میں ایسے معاملات کے سلسلہ میں سیکولر نقطۂ نگاہ سے گفتگو کرنی چاہیئے۔ اسلام کو درمیان میں نہیں لانا چاہیئے۔ اسلام کی بات اسلامی مملکت میں ہی ہو سکتی ہے۔

باسمہٖ تعالےٰ

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا

کیا حسین تھا یہ خواب!

پرویزؔ

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:

ز روزگارِ خویش ندانم جز ایں قدر
خوابم ز یاد رفتہ و تعبیرم آرزوست

"میری سرگذشت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ایک خواب تھا جو بھول گیا اور اب میں اس کی تعبیر کی تلاش کر رہا ہوں ——— بھولے ہوئے خواب کی تعبیر کی تلاش"!

یہ ہے پاکستان کی داستان کا ملخص جسے اس خواب کے دیکھنے والے نے انتہائی درد و داغ اور سوز و گداز سے بیان کیا ہے۔

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

کیسا حسین تھا یہ خواب!

(پرویز)

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو اقبال پارک لاہور، میں (جسے اس زمانے میں منٹو پارک کہتے تھے) غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کے اجتماعِ عظیم میں انتہائی جوش و خروش اور جذب و خلوص کے ساتھ، وہ ریزولیوشن پاس ہوا جسے "قرارداد پاکستان" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس میں مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ، آزاد مملکت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں ہر ایک کو معلوم تھا کہ اس مملکت کا مطالبہ کیوں کیا گیا ہے اور اس کی غرض و غایت کیا ہے کیونکہ اس کا مطالبہ کرنے والوں (علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ) نے اس کی اس طرح وضاحت کر دی تھی کہ اس میں نہ کسی شک و شبہ کی گنجائش تھی اور نہ ہی کسی التباس و ابہام کا امکان۔ لیکن (جائے صد حیرت ہے کہ) حصولِ پاکستان کے بعد اس مملکت کی غرض و غایت اور اس کا مطلوب و مقصود (یا نصب العین) آہستہ آہستہ نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔ جن لوگوں نے اس مطالبہ کی تحریک میں حصہ لیا تھا یا جو اس کے عینی شاہد تھے، رفتہ رفتہ وہ بھی دنیا سے چلے گئے ——— اور باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہماری نئی نسل (یا یوں کہئے کہ موجودہ قوم) کے ذہن سے اس کا تصور ہی محو ہو چکا ہے۔ حتیٰ کہ ان میں سے بعض کو یہ کچھ کہتے بھی سنا گیا ہے کہ تقسیم ہند کا فائدہ کیا تھا اور ہم نے الگ مملکت بنا کر حاصل کیا کیا؟ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے وساوس کے عام کرنے میں پاکستان دشمن عناصر کی سازش بھی کارفرما ہوتی ہے لیکن ہمارا نوجوان طبقہ ان سے متاثر اس لئے ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے اعتراضات کا مناسب جواب انکے پاس نہیں ہوتا۔ اور جس قسم کا پاکستان انکے سامنے ہے اس سے اس کے اعتراضات کو اور بھی تقویت مل جاتی ہے۔

طلوعِ اسلام نے اپنا فریضہ قرار دیا کہ وہ اس مملکت کی تشکیل کی غرض و غایت کی عام نشر و اشاعت کرتا رہے۔ چنانچہ وہ آغازِ پاکستان ہی سے اس فریضہ کو مسلسل ادا کئے چلا آ رہا ہے۔ چونکہ پاکستان کی غرض و غایت متعین تھی اس لئے ظاہر ہے کہ جب اسے بار بار سامنے لایا جائے گا تو اس میں تکرار لازمی ہوگی۔ چنانچہ قارئین طلوعِ اسلام کا وہ طبقہ جو شروع سے اس کے ساتھ وابستہ چلا آ رہا ہے بعض اوقات اس تکرار کو خوش آئند نہیں قرار دیتا لیکن اس کے باوجود ہم اس کی بار بار نشر و اشاعت کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ قوم کی مثال تو ایک جوئے رواں کی سی ہوتی ہے جس میں ہر آن نیا پانی سامنے آتا ہے یعنی قوم کے پرانے افراد آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور نئے افراد ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ قوم کے یہ نئے افراد ہیں جو پاکستان کی غرض و غایت سے بے بہرہ ہیں اور ان کی معلومات کیلئے

ضروری ہے کہ اسے بار بار سامنے لایا جائے۔ یہ وجہ ہے جو طلوعِ اسلام ان مقالات و خطابات کو تکرار و اصرار شائع کرتا رہتا ہے، اس امید کے ساتھ کہ ـــ شاید کہ خود را باز آفرینی!

اسلام، ایک زندہ نظامِ حیات بننے کے لئے، اپنی آزاد مملکت کا متقاضی ہے۔ یہ وہ شرط ہے جس کے پورا نہ ہونے سے وہ دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب بن کر رہ جاتا ہے، دین یعنی نظامِ حیات نہیں بن سکتا۔ (مثلاً) اس نظام کے بنیادی ستون اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہیں، اور اس کا اصل الاصول، امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ ہمارے مروّجہ تصورِ اسلام کی رُو سے، اقامتِ صلوٰۃ کے معنی ہیں صرف نماز پڑھنا اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم غریبوں اور گداگروں کو کچھ پیسے بطورِ خیرات دے دینا۔ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے مقصود ہے لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی بات کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ فرائض، ہم انگریز کے عہد غلامی میں بھی آزادانہ ادا کر سکتے تھے اور آج بھارت کا مسلمان، باین ہمہ بے بسی و بے کسی، انہیں اپنے طور پر ادا کر سکتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم ان کی ادائیگی کے لئے اپنی حکومت کا قیام لازمی شرط قرار دیتا ہے جہاں کہتا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ۔ (۲۲/۴۱) یہ وہ لوگ ہیں (یعنی جماعتِ مومنین) کہ جب انہیں حکومت ملے گی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا انصرام کریں گے۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا فریضۂ حیات ہوگا۔ یا (مثلاً) مذہبی سطح پر اسلام سے مقصود یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت کرے اور شرک سے مجتنب رہے یعنی بتوں کی پرستش نہ کرے۔ اس مقصد کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ ہر مقام پر، ہر حال میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم میں ہے کہ دین کے تمکن کے لئے استخلاف فی الارض ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نہ خدا کی عبودیت اختیار کی جا سکتی ہے اور نہ شرک سے اجتناب ممکن ہے۔ سورۂ نور میں ہے کہ خدا نے تم سے حکومت کا وعدہ کر رکھا ہے تاکہ تم اس کی عبودیت اختیار کر سکو اور شرک سے بچ سکو ـــ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا (۲۴/۵۵)۔ جب رسول اللہ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو قبیلہ بنی عامر کا ایک بہت بڑا سردار آپ کے پاس آیا اور اس دعوت کے مقاصد کے متعلق وضاحت چاہی۔ آپ کی وضاحت پر اس نے پوچھا کہ اگر میں ان امور پر کاربند ہو گیا تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ جنّت، یعنی باغ و بہارِ آخرت ـــ ہمیشہ رہنے والی زندگی ـــ اس نے کہا کہ یہ بعد کی بات ہے۔ میں یہاں کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ ـــ نعم النصر والتمکین فی البلاد۔ اس دنیا میں فتوحات اور حکومت حاصل ہوگی۔ (الکامل)

اسلام کا تقاضا یہ تھا اسلام کے دین (یعنی زندہ نظامِ حیات) بننے کا تقاضا جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ

> اس سے اسلام، اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔ (خطبۂ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء)

اس سے بھی پہلے انہوں نے اپنے خطبات میں اس حقیقت کی وضاحت کر دی تھی کہ

> اسلامی نقطۂ نگاہ سے مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رُو سے اسلام کے مثالی تصورات کو زمان و مکان کی قوتوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ان بلند تصورات کو انسانی ہیئتِ اجتماعیہ میں منتقل کرنے کا نام ہے۔

اس مملکت میں عبادت نام ہوتا ہے قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرنے کا اور شرک سے مفہوم ہوتا ہے انسانوں کے خود ساختہ احکام و قوانین کی اطاعت۔ اقامتِ صلوٰۃ سے مقصود ہوتا ہے ایک ایسے معاشرہ کا قیام جس میں تمام افراد معاشرہ ان قوانین کا ازخود، بہ طیبِ خاطر، اتباع کرتے جائیں[1]۔ اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم ہوتا ہے تمام افرادِ معاشرہ (بلکہ عالمگیر انسانیت) کو سامانِ نشو و نما دیا کرنا۔ اس میں امر بالمعروف کے معنی ہوتے ہیں ان احکام و ضوابط کا نافذ کرنا جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور اُن سے قانوناً روکنا جنہیں وہ مذموم قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ اقبالؒ نے لکھا تھا کہ

> اسلام تخت و تاج سے وفاشعاری کا مطالبہ نہیں کرتا۔ وہ صرف خدا (کے قوانین) سے عہدِ وفا استوار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ (خطبات)

اور قائداعظمؒ نے کہا تھا کہ

> اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ (حیدرآباد دکن ۱۹۴۱ء)

یہ ہے ایک اسلامی مملکت کی تخلیق و تشکیل کی وجہِ جواز۔ اور یہ تھی وہ بنیاد جس پر مطالبۂ پاکستان کی عمارت استوار کی گئی تھی اور جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔

لوحِ سادہ

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ نبی اکرمؐ نے جب اسلام کی انقلابی دعوت پیش کی تو اس میں مخالفین کے ساتھ سب سے بڑی وجۂ نزاع اور سبب شدید سبب تصادم کیا تھا؟ انہیں زندگی کے اس نظامِ نو کی طرف دعوت دی جاتی تھی اور وہ اس کے جواب میں کہتے تھے کہ —— اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ۔ (۲۳ / ۲۲)۔ ہم اس نئے نظام کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اُسی مسلک پر چلتے رہنا چاہتے ہیں۔ جو ہمارے اسلاف سے ہم میں متوارث چلا آرہا ہے۔ ہم انہی کے نقوشِ قدم کا اتباع کریں گے۔ ہم اپنی روایاتِ کہنہ کو نہیں چھوڑنا چاہتے۔

---

[1] اجتماعاتِ صلوٰۃ اسی نظام کا ایک گوشہ اور اسی مقصود کے حصول کا ایک ذریعہ ہیں۔

اُن سے اس کے جواب میں کہا جاتا کہ — اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ (۴۳/۲۴) جو کچھ تمہارے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اگر یہ اُس سے بہتر ہو جس پر تم اپنے آباؤ اجداد کی تقلید میں چلے جا رہے ہو تو کیا تم پھر بھی اپنے اسلاف کے مسلک ہی کو ترجیح دو گے؟ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہاں! ہم اُسی مسلک کا اتباع کریں گے ہمیں کسی نظامِ نو کی ضرورت نہیں — حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (۵/۱۰۴)۔ وہ مسلک ہمارے لئے ہر اعتبار سے کافی ہے۔
یہی وہ بنیادی کشمکش جو اس قدر شدید تصادمات کا موجب بنی۔ جب ان مخالفین نے دیکھا کہ یہ نظام زور پکڑتا جا رہا ہے تو انہوں نے چاہا کہ اس سے کچھ مفاہمت کی صورت نکل آئے۔ یعنی کچھ باتیں اس نظامِ جدید کی سے لی جائیں اور کچھ ان کے مسلکِ آباء کی۔ اور دونوں کے امتزاج سے ایک نظام وضع کر لیا جائے۔ لیکن دین کے نقطۂ نگاہ سے ایسا کرنا شرک ہوتا اس لئے رسول اللہ سے بتاکید کہہ دیا گیا کہ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا۔ دیکھنا! ان لوگوں کی طرف ذرا سا بھی جھک نہ جانا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ۔ تمہاری جماعت بھی اسی عذاب میں گرفتار ہو جائے گی جس میں یہ لوگ ماخوذ ہیں اور جس سے نکالنے کے لئے انہیں اس نظام کی طرف دعوت دی جا رہی ہے۔

لہٰذا، ایک قرآنی مملکت کی تشکیل کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ ان تمام نظریاتِ حیات و تصوراتِ زندگی، ان تمام روایاتِ کہنہ اور مسالکِ قدیمہ کو پرکھا جائے جو اس قوم میں متوارث چلے آ رہے ہیں۔ اس مملکت کا بنیادی پتھر —— لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ — ہے اس میں لَآ اِلٰهَ کے معنی یہ ہیں کہ تمام مروجہ تصورات کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے اور جو کچھ الحق (کتاب اللہ) کے خلاف ہو اسے یکسر مٹا دیا جائے۔ اور اس طرح سادہ پر زندگی کا نیا نقشہ مرتب کیا جائے۔ اس کے بغیر، اس جدید نظام کی عمارت (جس کی بنیاد اِلَّا اللّٰهُ پر استوار ہوتی ہے) قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ؎

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

اسلام میں "بت پرستی" کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ بُت تو فارسی زبان کا لفظ ہے۔ قرآن کریم میں اس کے لئے اوثان کا لفظ آیا ہے جو وثن کی جمع ہے اور وثن کے معنی ہوتے ہیں جمود و تعطل، عدمِ حرکت، جامد و غیر متحرک ہو جانا — اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے ہر وہ تصور یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے وثن ہے۔ جب قرآنی ضابطۂ حیات کو عملی شکل دے دی جائے تو اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو حرکتِ پیہم اور سعیٔ مسلسل کا آئینہ دار ہوتا ہے —— "حرکتِ پیہم" کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ، قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے زمانہ کے بدلتے ہوئے اور بڑھتے رہنے والے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔ یوں یہ نظام ایک ذی حیات تحریک (DYNAMIC MOVEMENT) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر یہ کسی ایک مقام پر رک جائے، اس میں جمود پیدا ہو جائے تو یہ وثنیت ہو گی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پر ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا چکا ہو۔ حیرت ہے کہ ہم نے قرآن کے اس عظیم نکتہ کو پس پشت ڈال دیا اور مغرب کے مفکرین کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ چنانچہ "وائٹ ہیڈ" لکھتا ہے کہ

بت پرستی کی تہ و حقیقت مروجہ خداؤں پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا ہے۔[۱]

---

[۱] A. N. WHITEHEAD — ADVENTURE OF IDEAS — P 12.

اس قسم کی بت پرستی ہیں، ایک زندہ اور متحرک نظامِ حیات کے تصورات و مناسک کی محض شکلیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ان کے معانی و مفہوم ختم ہو جاتے ہیں۔ مذہب، دین کی ممی شدہ لاش ہوتا ہے۔ ان بے روح رسوم، اور بے جان معتقدات سے چپکے رہنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق وہائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ

> زندگی کے بیجان پیکروں کے ساتھ چپکے رہنے کا نتیجہ سُست رفتار زوال ہوتا ہے جس میں ان رسوم کو بلانتیجہ دہرایا جاتا ہے۔ اس سے تہذیب و ترقی کا محض سراب باقی رہ جاتا ہے حقیقت غائب ہو جاتی ہے۔ (ایضاً)

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان، بلا سوچے سمجھے اور بلا اختیار و ارادہ، اپنے اسلاف کے مسلک پر چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں آگے بڑھنے اور کچھ اور بننے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ بکری کا بچہ بکری ہی بن سکتا ہے۔ اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ نوعِ انسان کی یہ خوش قسمتی ہے کہ انسانی تاریخ میں ایسے ادوار آتے رہے جن میں تقلید کی ان برفانی سلوں کو توڑ کر کاروانِ انسانیت کے لئے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار کیا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کا انسان بھی، اپنے اسلاف کی طرح، غاروں میں پڑا زندگی بسر کرتا۔ یاد رکھئے، جوہرِ زندگی کی نمود، اپنے اختیار و ارادہ اور فکر و بصیرت سے، تعمیری کام سرانجام دینے سے ہوتی ہے۔ اگر وہ کام جنہیں عام طور پر نیکی کہا جاتا ہے، محض تقلیداً کئے جائیں تو یہ انسانی زندگی میں نشو و ارتقاء کا موجب نہیں بن سکتے۔ انسانی زندگی میں (MORAL) تو خیر بڑی چیز ہے، اس میں (IMMORAL) ہونا اتنا تباہ کن نہیں جتنا ہلاکت آفریں (AMORAL) ہونا ہے۔ تقلید میں انسان (AMORAL) ہو جاتا ہے۔

یہی وہ جمود ہے جسے توڑنے کے لئے اقبالؒ کہتا ہے کہ

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش ‌ ‌ ‌ براہِ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارے نادر آید ‌ ‌ ‌ گناہے ہم اگر باشد ثواب است

قرآنِ کریم نے اپنا تعارف کراتے یا یوں کہئے کہ اپنے نزول کا مقصد بتاتے ہوئے کہا ہے کہ اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ (۹۷/۱)۔ یعنی قرآن دنیا میں نئی اقدار لایا ہے۔ اس کی آمد سے ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے تمام قدیم پیمانے الٹ گئے ہیں۔ اور ان کی جگہ ان نئے پیمانوں نے لے لی ہے۔ قرآن کی اولین مخاطب قوم کی طرف سے جو اس کی مخالفت ہوئی تھی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے قدیم پیمانوں کو، جو ان کے اسلاف کی طرف سے متوارث چلے آرہے تھے، ان جدید پیمانوں سے بدلنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اقبالؒ نے جب پاکستان کا تصور دیا تھا تو اس مملکت کو وجود میں لانے کا مقصد یہ بتایا تھا کہ

> اس سے اسلام کو ایسا موقعہ میسر آجائے گا جس سے یہ اس ٹھپہ کو مٹا سکے گا جو عرب ملوکیت نے زبردستی اس پر لگا رکھا ہے۔ (خطبۂ الٰہ آباد)

ہمارا مروجہ مذہب، ہماری شریعت، ہمارا کلچر، ہماری روایات، ہمارا فلسفۂ حیات، ہمارے رسوم و مناسک غرضیکہ ہر وہ شے جسے ہم اس وقت عام طور پر اسلامی کہہ کر پکارتے ہیں، عرب ملوکیت کے دور کی پیدا کردہ ہے۔ اقبالؒ نے اس کے لئے "عجمی اسلام" کی اصطلاح وضع کی تھی کیونکہ یہ پیدا تو عرب

روشن کہن

ملوکیت کے زمانہ (بالخصوص دورِ عباسیہ) میں ہوا تھا لیکن تھا عجم سے مستعار لئے ہوئے تصورات کا مجموعہ۔ اسی لئے حکیم الامت نے مروّجہ اسلام پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

شریعت، طریقت، تصوف، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

پاکستان کی تشکیل سے مقصد ان "بتانِ عجم" کو حریم کعبہ سے نکال کر، اسے خالصۃً "خدا کے گھر" میں تبدیل کرنا تھا۔ یعنی ہمارے ہاں "جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے" اس کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لے کر معاشرہ کو از سرِ نو مستقل اقدارِ خداوندی کے خطوط پر متشکل کرنا۔ ان مستقل اقدار کی ہلکی سی جھلک ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

حاکم و محکوم کا امتیاز

قرآنی مملکت میں حاکم اور محکوم کا تصور نہیں ہوتا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس مملکت کا بنیادی فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ قرآن کریم نے یہ فریضہ امت کے کسی خاص گروہ کا قرار نہیں دیا۔ بلکہ ساری کی ساری امت کا قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۱۰)۔ تم وہ بہترین امت ہو جسے ہم نے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے متشکل کیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے، تقسیمِ عمل کے اصول کے مطابق، مختلف کام مختلف افراد کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ گویا یہ ایک ٹیم ہوتی ہے جو باہمی تعاون سے زندگی کو اس کی منزلِ مقصود تک لے جاتی ہے۔ اس میں افسر اور ماتحت یا حاکم اور محکوم کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ الدّین۔ یعنی قرآنی نظام کی خصوصیتِ کبریٰ یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا۔ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (۸۲/۱۹)۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر کسی قسم کا کوئی کنٹرول یا حقِ حکومت رکھے، نہ کوئی کسی دوسرے کا محتاج ہو۔ اس میں تمام معاملات قوانینِ خداوندی کے مطابق طے پاتے چلے جائیں۔ اس میں کسی کو اس کا حق نہیں ہوتا کہ دوسرے سے کہے کہ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ (۳/۷۸) تم میرے محکوم ہو جاؤ۔ قرآن کریم کے الفاظ میں یہ اختیار تو خود رسول اللہؐ کو بھی حاصل نہیں تھا سورۂ آلِ عمران کی آیت نمبر ۷۸ اس پر شاہد ہے۔

جب عہدِ فاروقی میں روم کا سفیر مدینہ آیا اور اس نے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کون ہے، تو صحابہؓ کی طرف سے اس کا جواب یہ ملا تھا کہ مالنا ملك۔ بل لنا امیر۔ ہمارا بادشاہ کوئی نہیں۔ ہمارا صرف امیر ہے۔ واضح رہے کہ لفظ امیر کے بنیادی معنی مشورہ کرنے والے یا راہ نمائی کرنے والے کے ہیں۔ امت جس شخص کے سپرد یہ امانت کرتی ہے، اس کا فریضہ کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق امت کے سب سے بڑے منتخب کردہ امیر، صدیق اکبرؓ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں ان الفاظ میں وضاحت کر دی تھی کہ

یاد رکھو! تم میں سے ہر کمزور، طاقتور ہے جب تک میں اس کا حق نہ دلاؤں اور ہر طاقتور کمزور ہے جب تک

اس سے کمزور کا حق نہ لے لیا جائے۔

اس فریضہ کو حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ

یاد رکھو! اگر کوئی شخص کسی پر زیادتی کرے گا تو میں اس وقت تک اسے نہ چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر لگا کر دوسرے رخسار پر پاؤں نہ ٹکا دوں۔ تا آنکہ وہ حق کے سامنے سر انداز ہو جائے۔ لیکن تم میں سے حقدار کے لئے میں اپنا رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔

خلافت اور ملوکیت میں فرق

وہ اکثر لوگوں سے دریافت کرتے رہتے کہ میں کہیں خلافت سے روگردانی کر کے بادشاہت کی طرف تو نہیں جا رہا؟ ایک دفعہ جب انہوں نے یہی سوال دہرایا تو ایک شخص نے جواب میں کہا کہ خلافت اور بادشاہت کا فرق بڑا نمایاں ہے اس لئے اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارے ہاں خلافت ہے یا بادشاہت۔ خلیفہ تمام افرادِ معاشرہ کے حقوق کا محافظ ہوتا ہے اور بادشاہ ان کے حقوق میں ظلم اور جبر کرتا ہے۔ وہ ایک طرف سے لوٹتا ہے اور دوسری طرف (اپنے مقاصد کے لئے) خرچ کرتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ خلیفہ ہیں، بادشاہ نہیں۔

انہوں نے اپنے پہلے خطبہ میں کہا تھا کہ

لوگو! میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں، میں ان کی وضاحت کرتا ہوں۔ تمہارا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ تمہارے اموال میں سے کوئی چیز نہ لوں۔ مگر قانونِ خداوندی کے مطابق۔ اور جو کچھ لوں اس میں سے کچھ خرچ نہ کروں مگر حق کے مطابق۔

اور یہ بھی کہا تھا کہ

تمہارا مجھ پر یہ بھی حق ہے کہ جب تم مہمات کے سلسلہ میں اپنے بچوں سے دور ہو جاؤ تو میں ان بچوں کا باپ ہوں۔

وہ کہا کرتے تھے کہ میری اور دیگر افرادِ معاشرہ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پارٹی سفر کے لئے نکلے تو سب لوگ اپنے پیسے ایک شخص کے سپرد کر دیں کہ وہ سفر کے سلسلہ میں ضروری اخراجات کرتا جائے اور اس کا حساب رکھے۔　　لہٰذا، مسلمانوں کے مال میں میرا حصہ اتنا ہی ہے کہ کپڑوں کے دو جوڑے۔ ایک گرمی کا اور ایک سردی کا اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے اتنا کھانا جو قریش کے ایک عام آدمی کی خوراک ہے۔

اہل و عیال کے معاملہ میں ایک طرف قرآن نے انہیں زِينَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۱۸/۴۶)۔ کہا ہے۔ انہیں آنکھوں کی ٹھنڈک (قُرَّةَ اَعْيُنٍ ۲۵/۷۴) کا موجب قرار دیا ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی بتا دیا ہے کہ یاد رکھو۔ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۶۴/۱۵) یہ انسان کے لئے بہت بڑی آزمائش کا موجب بن جاتے ہیں اور مقاصدِ حیات میں تمہارے سب سے بڑے دشمن

بیوی بچے فتنہ بن جائیں

اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ (۶۴/۱۴)۔ یاد رکھو! تمہاری اولاد اور بیویاں بعض اوقات تمہاری سب سے بڑی دشمن ہوتی ہیں" تمہاری زندگی کے بڑے بڑے بلند مقاصد انہی کے ہاتھوں تباہ ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے تمہارے پاؤں میں ایسی لغزش آتی ہے کہ تم اپنے مقام بلند و رفیع سے گر کر حکمِ جور ہو جاتے ہو۔ اس لئے فَاحْذَرُوْهُمْ۔ ان سے

بہت محتاط رہنا۔ قرآنی مملکت میں اس لغزش کی گھاٹی کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی ایک بیوی تھی جسے ان کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ جب امورِ خلافت ان کے سپرد ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ امورِ مملکت میں دخیل ہوتی ہے اور بعض اوقات غلط سفارشات کر دیتی ہے۔ جب اس نے تنبیہ کے باوجود اپنی اس عادت کو نہ بدلا تو آپ نے اُسے طلاق دے دی۔ اولاد کے بارے میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ عراق کے گورنر (حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ) نے ان کے دو لڑکوں (جناب عبداللہ اور عبید اللہ) کو کچھ رقم خزانہ میں داخل کرنے کے لئے دی۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہم اس رقم کو قرض سمجھ کر اس سے تجارت کرلیں اور پھر اصل رقم بیت المال میں جمع کرادیں تو اس کی اجازت ہے؟ انہوں نے اجازت دے دی۔ جب حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ اس مال کی تجارت سے جو منافع ہوا ہے وہ بھی بیت المال میں داخل کرانا ہوگا۔ بیٹوں نے کہا کہ گورنر نے انہیں اس کی اجازت دے دی تھی۔ اس پر آپ نے پوچھا کہ کیا اس نے کسی اور کو بھی اس قسم کی اجازت دی تھی یا تمہارے ساتھ یہ رعایت برتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ کسی اور کو تو اس قسم کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اس پر آپ نے کہا کہ اس نے یہ رعایت تمہیں امیرالمومنین کے بیٹے ہونے کی وجہ سے دی ہے۔ اور یہیں سے فساد کی ابتداء ہوا کرتی ہے۔ قرآنی مملکت میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے میں اپنے فیصلے کو واپس نہیں لینا چاہتا —— اس باب میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب وہ امہات المومنینؓ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہراتؓ) کو بیت المال سے کوئی چیز بطور تحفہ بھیجتے تو حضرت حفصہؓ کا حصہ آخر میں لگتے کہ اگر مقدار میں کچھ کمی رہ جائے تو وہ اُن کے حصے میں ہو۔ یہ اس لئے کہ حضرت حفصہؓ، حضرت عمرؓ کی بیٹی بھی تھیں —— قحط کے زمانے میں آپ نے گلی میں ایک بچی کو دیکھا کہ بھوک سے نڈھال ہو رہی ہے۔ آپ کو اس سے بڑا صدمہ ہوا۔ کہا کہ کوئی پہچانتا ہے کہ یہ بچی کون ہے؟ بیٹا ساتھ تھا۔ اس نے کہا کہ آپ کی پوتی (فلاں) ہے۔ آپ نے کہا کہ اس کی حالت ایسی کیوں ہو رہی ہے۔ اس نے کہا کہ قحط کی وجہ سے جتنا کچھ ملتا ہے اس میں یہ حالت نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا —؟ آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور کہا کہ پھر جو حال قوم کے دوسرے بچوں کا وہی عمرؓ کی پوتی کا ہوگا۔ تنگی ہوگی تو سب پر اور کشادگی ہوگی تو سب کے لئے۔ ان کا دستور تھا کہ

> جب مملکت میں کوئی امتناعی حکم نافذ کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کرکے ان سے کہتے کہ میں نے فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ اور لوگ تمہاری طرف ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے پرندے گوشت کی طرف اگر تم محتاط ہوگے تو وہ بھی رہیں گے۔ اور اگر تم میں سے کسی نے ایسا کیا تو (چونکہ تمہارے اعمال کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے) تمہیں اُن سے دگنی سزا دوں گا۔ اب تمہارا اختیار ہے، چاہے آگے بڑھو اور چاہے پیچھے ہٹو۔ (تاریخ عمر۔ ابن جوزی)

عدل

قرآنی مملکت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر ایک سے عدل ہوتا ہے۔ عدل کی ایک شکل یہ ہے کہ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ قانون کے مطابق کیا جائے اور اس میں کسی کی رو رعایت نہ کی جائے۔ یہی ہے وہ مملکت جس میں ہر صاحبِ اقتدار سے یہ کہا جاتا ہے کہ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی (۳۸/۲۶)

تمہیں مملکت میں صاحبِ اختیار اس لئے بنایا گیا ہے کہ تم لوگوں کے فیصلے حق کے ساتھ کرو اور اس میں اپنے جذبات کو کبھی دخیل نہ ہونے دو۔

یہاں کہا گیا ہے کہ لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ حق کے ساتھ کرو۔ یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے۔ عدل کا عام تصور یہی ہے کہ اگر معاملات کا تصفیہ ملک کے رائج الوقت قانون کے مطابق ہو تو کہا جائے گا کہ عدل کا تقاضا پورا ہو گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود وہ قانون جس کے مطابق فیصلہ ہوا ہے، عدل پر مبنی نہیں تو اس کے مطابق فیصلہ کو مبنی بر عدل کیسے کہا جائے گا؟ اگر قانون کے استعمال میں جذبات اثر انداز ہو سکتے ہیں تو قانون سازی میں جذبات کیوں اثر انداز نہیں ہو سکتے! یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں قانون سازی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں تمام قوانین، اصولی طور پر، خدا کے متعین فرمودہ (قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ) ہوتے ہیں۔ اور مملکت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان قوانین کو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق نافذ العمل بنائے۔ قرآن کریم کا تعارف سب سے پہلی آیت میں "الکتاب" کہہ کر کرایا گیا ہے۔ الکتاب ضابطۂ قوانین کو کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں چند ایک قوانین تفصیلی طور پر دیئے گئے ہیں اور باقی اصولی طور پر درج ہیں۔ ان اصولی قوانین کی جزئیات، ہر زمانے کی امت، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے مرتب کرے گی۔ ان جزئیات (یا بائی لاز) میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ لیکن اصولی قوانین ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔ ان میں تبدیلی کا حق کسی ایک فرد یا پارلیمان تو ایک طرف، ساری دنیا کی آبادی کو بھی حاصل نہیں ہوگا۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ اسلامی مملکت میں تمام امور کے فیصلے الحق کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہ قرآن کی بڑی جامع اصطلاح ہے، اور جو کچھ ابھی ابھی کہا گیا ہے وہ اس کی تشریح ہے۔ حق اسے کہتے ہیں جو اپنی جگہ پر اٹل اور محکم ہو۔ لیکن اس کی یہ محکمیت پتھر کی سی نہیں ہوتی جو جامد اور ساکت ہوتی ہے (امام راغب کے الفاظ میں) اس کی محکمیت، دروازے کی سی ہوتی ہے جو اپنے مقام پر محکم بھی ہوتا ہے اور ضرورت کے مطابق حرکت بھی کرتا ہے۔ محکمیت اور حرکت کے اس امتزاج کو حق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر ان میں سے ایک شرط بھی گم ہے تو وہ قانون اسلامی نہیں کہلا سکتا۔ یعنی کسی قانون کے اسلامی قرار پانے کے لئے ضروری ہے کہ، (۱) اسے قرآن کی سند حاصل ہو، (۲) زمانے کے تقاضوں کو پورا کرے، اور (۳) اس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو کسی سابقہ زمانے کے وضع کردہ فقہی قوانین تمام زمانوں کے لئے اسلامی قوانین قرار نہیں پا سکتے۔ قرآنی قوانین کے مطابق عدل میں کیفیت یہ ہوگی کہ،

یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا وَّ لَا یُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا یُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّ لَا هُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ (۲/۴۸)

اس دور میں کوئی بھی شخص (قانون کے مقابلہ میں) کسی دوسرے شخص کے کام نہیں آسکے گا، نہ ہی کسی کی سفارش مجرم کو بچا سکے گی، نہ ہی اس سے کچھ لے لوا کر اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ ہی کوئی کسی اور طرح مجرم کی مدد کر سکے گا۔

اس میں مجرم چھپا نہیں رہ سکتا، دور سے پہچانا جا سکتا ہے۔ یُعۡرَفُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ بِسِیۡمٰهُمۡ (۵۵/۴۱) "اس میں مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے"۔ اس میں انتظام ایسا ہوگا کہ مجرم، شریف انسانوں سے بالکل الگ نظر آئیں ـــ وَامۡتَازُوا الۡیَوۡمَ اَیُّهَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ (۳۶/۵۹) تاکہ کوئی شخص ایسے لوگوں سے دھوکا نہ کھا سکے۔ اس میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی مجرم، مواخذہ سے بچ جائے یا کوئی بے گناہ یونہی دھر لیا جائے۔ لَا تَکۡسِبُ کُلُّ نَفۡسٍ اِلَّا عَلَیۡهَا (۶/۱۶۵)

اس میں ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق بدلہ پاتا ہے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی (۶/۱۶۵)۔ اس کوئی بوجھ اٹھانے والا

کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

قرآنی مملکت میں، بڑی سے بڑی شخصیت بھی قانون کی زد سے باہر نہیں ہوتی۔ اس باب میں، اور تو اور، خود حضور رسالتمآبؐ کی زبانِ اقدس سے بھی یہ اعلان ہوا کہ

إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۶/۱۵)

اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مواخذہ سے سخت ڈرتا ہوں۔

اور اس کے بعد فرمایا کہ اگر میری چہیتی بیٹی ... فاطمہؓ ... بھی قانون شکنی کرے تو میں اسے بھی سخت سزا دوں گا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مصر کے گورنر کے بیٹے نے ایک مصری کو کسی بات پر یہ کہہ کر ہنٹر سے پیٹا کہ تم بڑے آدمیوں کی اولاد سے گستاخی سے پیش آتے ہو تو آپ نے گورنر، اس کے بیٹے اور اس مصری کو مدینہ بلوا بھیجا۔ مصری کے ہاتھ میں ہنٹر دیا اور کہا کہ اسے اسی طرح مارو اور کہو کہ تم نے دیکھ لیا کہ بڑوں کی اولاد کا حشر کیا ہوتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی اس گورنر کو بھی تادیب کی کہ اگر تم نے بیٹے کی تربیت صحیح کی ہوتی تو اس کے سر میں یہ خناس کیوں سماتا کہ وہ بڑوں کی اولاد ہے اس لئے اُسے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا حق حاصل ہے۔ خود حضرت عمرؓ کو ایک مرتبہ ایک عدالت میں پیش ہونے کا اتفاق ہوا تو جج نے انہیں امتیازی مقام پر بیٹھنے کی پیش کش کی۔ آپ نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا اور مدعی کے برابر بیٹھ گئے۔ مقدمہ ختم ہونے کے بعد، آپ نے جج کو لکھا کہ تم جج بننے کے قابل نہیں ہو سکتے جب تک تم امیر المومنین اور ایک عام شہری کو یکساں نہ سمجھو۔

قرآنی مملکت میں یہ کیفیت تو عدالت کی ہوتی ہے لیکن اس میں مناسب تعلیم و تربیت سے خود افرادِ معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر ان سے کبھی کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو وہ خود اپنے آپ کو اپنے جرم کی سزا کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ ارتکابِ جرم کا کوئی اور شاہد ہو یا نہ ہو، خود خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل سب سے بڑا گواہ ہوتا ہے۔ وہ گواہ جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (۴۰/۱۹)

وہ نگاہ کی خیانت اور دل کے اندر گذرنے والے خیالات تک سے واقف ہوتا ہے۔

یہی تھی وہ تعلیم جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک رات حضرت عمرؓ حسبِ دستور افرادِ معاشرہ کے حالات کا براہِ راست مطالعہ کرنے کے لئے گشت کر رہے تھے کہ آپ نے سُنا کہ ایک خیمہ کے اندر ماں اپنی بیٹی سے کہہ رہی ہے کہ دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا کر اسے چولھے پر چڑھا دو۔ بیٹی نے کہا کہ امّی! میں دودھ میں پانی نہیں ڈالوں گی کیونکہ خلیفہ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ ماں نے جواب دیا کہ پانی ڈال دو، خلیفہ اس وقت کہاں دیکھ رہا ہے۔ لڑکی نے کہا کہ خلیفہ تو نہیں دیکھ رہا لیکن وہ خدا تو دیکھ رہا ہے جس کا حکم خلیفہ نے ہم تک پہنچایا تھا۔

خلیفہ نے گھر آکر بیوی سے کہا کہ صبح اُس خیمہ میں جاؤ اور اس لڑکی کی ماں سے لڑکی کا رشتہ مانگ لو۔ ایسی بچی جس گھر میں آجائے گی وہ گھر نور سے بھر جائے گا۔ چنانچہ وہ بچی اس گھر کا نور بن گئی۔

پہل کہاں سے ہو؟

لیکن افرادِ معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب پہلے برسرِ اقتدار طبقہ خود اپنے کیریکٹر میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرے۔ لوگ قانون کی اطاعت کرتے ہی

اس وقت ہیں جب ان کے اربابِ حل وعقد خود قانون کی اطاعت کریں۔ اسی طبقہ کے بگڑنے سے ساری قوم بگڑتی ہے اور اسی کے سنورنے سے ساری قوم سنور جاتی ہے جب حضرت صالحؑ کو قوم ثمود کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا تو آپ نے دیکھا کہ قوم تمام کی تمام بگڑی ہوئی ہے۔ اس کی اصلاح کی صورت کیا ہوگی؟ تو خدا کی طرف سے جواب ملا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ـــ کَانَ فِی الْمَدِیْنَۃِ تِسْعَۃُ رَھْطٍ یُّفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا یُصْلِحُوْنَ (۲۷/۴۸)۔ مملکت کے مرکز میں قوم کے نو سرغنے ہیں اور وہی سارے فساد کا موجب ہیں اور قوم کے معاملات کو سنورنے نہیں دیتے۔ اگر وہ راہِ راست پر آجائیں تو ساری قوم سنور جائے گی۔ یہی تھی وہ حقیقت جسے حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

> عوام میں اس وقت تک ٹیڑھ پیدا نہیں ہوتی جب تک ان کے لیڈر سیدھے رہتے ہیں۔ جب تک راعی اللہ کی راہ میں چلتا ہے، رعایا اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ جہاں اس نے پاؤں پھیلائے، رعایا اس سے پہلے پاؤں پھیلا دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں، امیر کی اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے۔ قرآنِ کریم نے اس باب میں واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ عَنْ ذِکْرِنَا۔ جو ہمارے قوانین کو فراموش کر دے۔ وَاتَّبَعَ ھَوٰىہُ۔ اور اپنے مفاد اور جذبات کے پیچھے لگ جائے۔ وَکَانَ اَمْرُہٗ فُرُطًا (۱۸/۲۸)۔ اور یوں اس کے معاملات قاعدے اور قانون کی حدود سے تجاوز کر جائیں تو اس کی اطاعت مت کرو۔ اسی بناء پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ

> اگر نک کٹا، سیاہ فام حبشی بھی تمہارا امیر ہو تو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے، تم اس کے حکم کو سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ (مسلم)

اسی اصول کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے پہلے خطبہ خلافت میں، ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ

> تم میری اطاعت اس وقت تک کرو جب تک میں اللہ کے احکام کی اطاعت کروں۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں۔

اور حضرت عمرؓ نے اسے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ

> یاد رکھو! کوئی صاحبِ اختیار دنیا میں اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا کہ وہ اگر خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کرے تو اس کی اطاعت کی جائے۔

یہ اس لئے کہ قرآنی مملکت میں اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی ہوتی ہے، کسی انسان کی نہیں۔ ان کا امیر ان قوانین کے مطابق معاشرہ متشکل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر وہ خود ہی ان قوانین کی اطاعت نہ کرے تو دوسرے اس کی اطاعت کس طرح کریں گے؟ یہی وجہ ہے کہ اس نظام کے داعی اول، حضور نبی اکرمؐ نے خود فرما دیا کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ سب سے پہلے میں خود اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔

اس مقام پر اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ امیر کی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص کو اس کا اختیار دے دیا جائے کہ

جس وقت وہ سمجھے کہ امیر نے خدا کے کسی حکم کی اطاعت نہیں کی، وہ بغاوت کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ اس سے تو انارکی پھیل جاتی ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ قرآنی مملکت کے آئین میں اس قسم کا التزام کیا جائیگا کہ جس کی رو سے خود امیر مملکت کے اقدامات پر نگاہ رکھی جائے۔ اور جونہی وہ حد سے تجاوز کرے آئینی اور قانونی طور پر اس کا مواخذہ ہو سکے۔ اور اگر وہ مجرم ثابت ہو تو اس کی جگہ دوسرا امیر مقرر کر دیا جائے۔

سوشل جسٹس

یہ تھا عدالتی عدل یعنی قانون کے مطابق چلنے کا ایک گوشہ۔ اس کا دوسرا گوشہ وہ ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں عدلِ عمرانی (SOCIAL JUSTICE) کہا جاتا ہے۔ سوشل جسٹس کی اصطلاح آج کل بڑی عام ہو رہی ہے اور اس کا ہر جگہ چرچا سنائی دیتا ہے لیکن اس اصطلاح کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس کے متعلق ابھی تک متفقہ طور پر کچھ نہیں کہا گیا۔ یہ اصطلاح بھی، سوشلزم کی طرح، ہر ذہن میں الگ مفہوم کی حامل ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس سوسائٹی کو مبنی بر عدل (JUST) کہا جائے گا جس میں ہر فرد کو وہ کچھ مل جائے جس کا وہ حقدار ہے۔ لیکن یہیں سے پھر دوسرا سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ کس طرح متعین کیا جائے کہ کوئی شخص کس چیز کا حقدار ہے۔ مختلف افراد کے حق (یا واجب DUE) کا تعین پہلے سوال سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ اور اسی سے ساری پیچیدگیاں ابھرتی ہیں۔ ایک طرف سے جواب ملتا ہے کہ ایک شخص صرف اس کا حقدار ہے جو اسے معقول اخلاقی اصولوں (VALID MORAL PRINCIPLES) کے مطابق ملے۔ لیکن یہ اخلاقی اصول کیا ہیں؟ یہ سوال پھر بحث طلب رہ جاتا ہے۔ اس موضوع پر جو کچھ اس وقت تک میری نظروں سے گزرا ہے اس میں (EMIL BRUNNER) کا پیش کردہ مفہوم میرے نزدیک قرآنی تصور کے مطابق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

> جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل (JUST) اور فلاں ظلم پر مبنی (UNJUST) ہے، وہ درحقیقت کہنا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق الوہیاتی معیار موجود ہے۔ ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا۔ جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حق مطلق ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی میناکاری اور ملمع سازی ہوگی۔ (JUSTICE AND THE SOCIAL ORDER)

رزق کا حق

قرآن کی رو سے عدلِ عمرانی کی تعریف اسی قسم کی ہے۔ یعنی کسی شخص کو وہ کچھ مل جانا جس کا وہ از روئے قوانینِ خداوندی حقدار ہے، عدل کہلائے گا۔ اور یہ قوانین قرآن کے اندر موجود ہیں۔ لہٰذا، قرآن کی رو سے سوشل جسٹس کے معنی ہوں گے ہر شخص کو اس کا قرآنی حق ادا کر دینا۔ قرآنی مملکت اس قسم کے سوشل جسٹس کو عملاً

بروئے کار لانے کی ایجنسی ہے۔ ان بدیہی اور غیر مشروط حقوق میں قرآن نے سب سے پہلے ہر ذی حیات کے لئے رزق کا حق شامل کیا ہے۔ رزق کے معنی ہیں تمام وہ سامان اور ذرائع جن سے انسان کی جسمانی پرورش اور اس کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔

اس حق کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا۔ (۱۱/۶)

سطح ارض پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

قرآنی مملکت جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے، خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے اوپر لیتی ہے۔ اس لئے تمام افرادِ معاشرہ سے واضح الفاظ میں کہتی ہے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ۔ (۶/۱۵۲)

(تم معاش کی طرف سے مطمئن ہو کر بلند مقاصدِ حیات کے حصول کے لئے کوشاں رہو) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

ہمارے ہاں یہ بحث اکثر وجۂ نزاع بنی رہتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ وہ سرمایہ دارانہ ہے، رفاہی ہے یا اشتراکی۔ لیکن ہم اگر قرآنی مملکت کی اس عظیم ذمہ داری کو سامنے رکھیں جسے مندرجہ بالا آیت میں متعین کیا گیا ہے تو بات نکھر کر سامنے آجاتی اور سارا مسئلہ صاف ہو جاتا۔ اسلام میں معاشی نظام کا انداز کچھ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ وہ مقصود بالذات نہیں۔ سوال سارا یہ ہے کہ وہ ذمہ داری جسے مملکت اپنے سر لیتی ہے وہ کس طرح کے معاشی نظام سے پوری ہو سکتی ہے —— یعنی تمام افرادِ معاشرہ اور ان کی اولاد کے سامانِ زیست کی ذمہ داری —— اسی کو ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں یعنی نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما فراہم کرنا۔ اور جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے یہ قرآنی مملکت کے قیام کا بنیادی مقصد ہے۔

ظاہر ہے کہ مملکت اتنی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی جب تک رزق کی پیداوار کے ذرائع اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ رزق کی پیداوار کا بنیادی ذریعہ زمین ہے۔ اور قرآن کی رُو سے زمین پر —— جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ، انسانوں کی پرورش کے لئے عطا ہوئی ہے۔ انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسے قرآن نے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (۴۱/۱۰) قرار دیا ہے یعنی اسے تمام ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ کسی کی ملکیت میں نہیں چلا جانا چاہیئے۔ اسی حقیقت کو نبی اکرمؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔

اس سلسلہ میں آپؐ نے پہلا اصلاحی قدم یہ اٹھایا کہ زمینداری کے نظام کو ختم کر کے یہ فیصلہ کر دیا کہ زمین کاشتکار کے پاس رہے گی اور وہ بھی اتنی جتنی وہ خود کاشت کر سکے۔ اس کے بعد جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں عراق کی وسیع و عریض زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آئیں تو ان کی تقسیم کے سوال پر اچھی طرح بحث ہوئی اور بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ انہیں افراد میں تقسیم نہ کیا جائے بلکہ مملکت کی تحویل میں رکھا جائے۔ چنانچہ مملکت کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ —— لَنَا رِقَابُ الْأَرْضِ —— زمین مملکت کی رہے گی تاکہ اس کے مناسب انتظام سے افرادِ معاشرہ کو سامانِ رزق بہم پہنچایا جا سکے۔

ربوٰ کا مفہوم

زمین کی ملکیت یا تحویل کے بعد سب سے اہم سوال حصولِ دولت کا ہے۔ عصرِ حاضر میں

معیشت کا یہ مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ معاوضہ محنت (LABOUR) کا ہونا چاہیئے یا سرمایہ (CAPITAL) کا۔ اور جس انداز سے اس سوال پر بحث ہوتی ہے۔ اس سے ایسا نظر آتا ہے گویا یہ سوال دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ آیا ہے۔ حالانکہ ارباب فکر و نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ قرآن کریم نے اس سوال کو مدت ہوئی حل کر دیا تھا۔ قرآن نے ربوٰ کو حرام قرار دیا ہے۔ اور حرام بھی اس شدت کا کہ اس کے لئے کہا ہے کہ ایسا کرنا خدا اور رسول کے خلاف بغاوت ہے۔ ربوٰ کا ترجمہ ہمارے ہاں سود کیا جاتا ہے۔ اور اس ترجمہ کی بنا پر یہ بحثیں چل نکلی ہیں کہ تجارتی سود (COMMERCIAL INTEREST) اور بنکوں کا سود وغیرہ جائز ہے یا نہیں۔ آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ قرآن نے ربوٰ کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ لیکن ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو مجرم قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس ربوٰ کی یہ کیفیت ہے کہ اسے حرام قرار دیتے ہوئے کہا کہ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا۔ ربوٰ میں سے جو کچھ کسی کے ذمے باقی ہے اسے چھوڑ دو اور اس کے بعد کہا کہ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (۲/۲۷۹) اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اسے خدا و رسول (اسلامی نظام) کی طرف سے اعلانِ جنگ سمجھ لو۔ اس سے آپ دیکھئے کہ ربوٰ اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے ارتکاب کو نظام حکومت کی طرف سے اعلانِ جنگ قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ربوٰ کے معنی ہیں "سرمایہ پر بڑھوتی" (سود تو اس کی صرف ایک شکل کا نام ہے) قرآن جس قسم کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے اس میں سرمایہ کے معاوضہ کا اصول ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا، ربوٰ کا مرتکب، اسلامی مملکت کے اس نظام کے علی الرغم دوسرا نظام قائم کرنا چاہتا ہے اور ظاہر ہے کہ مملکت کے نظام کے خلاف دوسرا نظام قائم کرنا کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ اس لئے اسے "خدا اور رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا، قرآنی مملکت میں ایسا نظام جس میں سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے حرام ہی نہیں بلکہ مملکت کے خلاف بغاوت ہے۔ اس میں معاوضہ صرف محنت کا ہوگا، سرمایہ کا نہیں ہوگا۔ خواہ اس کی کوئی شکل ہو۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹)۔ یعنی انسان صرف اس کا حقدار ہے جس کے لئے وہ محنت کرے۔ اس کے نظام کا بنیادی اصول ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جب سرمایہ پر کچھ وصول ہی نہیں کیا جا سکے گا تو فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کی، جو نظامِ سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے کوئی قیمت ہی نہیں رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ضرورت سے زیادہ سب کچھ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دینے کا حکم دیا ہے۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زیادہ ہے، سب کا سب۔ اسی کی تفسیر رسول اللہ کی وہ حدیث کرتی ہے جس میں حضرت بلالؓ نے کہا ہے کہ

> رسول اللہ نے فرمایا کہ جو رزق تجھے عطا کیا گیا ہے اسے چھپا کر نہ رکھو۔ اور اس میں سے جو کچھ تجھ سے مانگا جائے اسے مت روکو۔ میں نے کہا۔ یا رسول اللہ! یہ کیسے ممکن ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یا تو ایسا کرنا ہوگا یا جہنم کا ایندھن بننا پڑے گا۔ (حاکم)

دولت کی تقسیم

اس وقت دنیا میں اشتراکی نظام (کمیونزم) کا بڑا شہرہ ہے۔ اس نظام کا سنگ بنیاد یہ اصول بنایا جاتا ہے۔

FROM EACH ACCORDING TO HIS CAPACITY
TO EACH ACCORDING TO HIS NEEDS.

یعنی ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے دیا جائے۔
اشتراکیت کا یہ اصول اس وقت تک محض ایک نظری اصول ہی ہے۔ اس پر عمل کہیں نہیں ہو رہا۔ جن ممالک کو اس وقت کمیونسٹ کہا جاتا ہے ان میں بھی کمیونزم کا نظام رائج نہیں۔ سوشلزم کا نظام رائج ہے۔ اس لئے ہنوز کمیونزم کا مندرجہ بالا اصول شرمندۂ معنی نہیں ہوا۔ لیکن اس اصول پر آج سے چودہ سو سال پہلے حجاز کی قرآنی مملکت میں عمل بھی ہو چکا ہے۔ اس میں شروع میں مالِ غنیمت کی تقسیم ہوتی تھی تو اس تقسیم میں رسول اللہ کا دستور یہ تھا کہ آپ غیر شادی شدہ کو ایک حصہ دیتے تھے اور شادی شدہ کو دُگنا حصہ۔ کیونکہ اس کی ضروریات زیادہ ہوتی تھیں۔ اس کے بعد جب افرادِ مملکت کے وظائف مقرر کر دیئے گئے تو ان میں بھی یہی اصول کارفرما رکھا گیا۔ یہ اس لئے کہ تمام افرادِ معاشرہ کو رزق ——— یعنی سامانِ زیست ——— مہیا کرنا اس مملکت کا فریضہ تھا۔ اس میں کوئی دوسرا اصول نافذالعمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس مملکت نے ایسا معاشرہ قائم کرنا تھا جس میں کیفیت یہ ہو کہ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى - وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى - (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) - نہ کوئی شخص بھوک اور پیاس کی وجہ سے پیٹ ان ہو اور نہ ہی وہ لباس اور مکان سے محروم رہے۔ یہ ہر فرد کی کم از کم بنیادی ضروریاتِ زندگی ہیں جن سے قرآنی مملکت میں کوئی بھی محروم نہیں رہ سکتا۔
لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس معاشرہ میں صرف انہی بنیادی ضروریات پر اکتفا کیا جاتا ہے اور دیگر سامانِ آسائش و زیبائش سے محرومی ہوتی ہے۔ جوں جوں اس معاشرہ میں ترقی ہوتی جاتی ہے اس کا نقشہ جنتی بنتا جاتا ہے جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ——— وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ (۲۲/۲۳) - نہایت اعلیٰ درجہ کے ریشمی ملبوسات - ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ - (۱۸/۳۱) دبیز و لطیف ریشم کے زرکار پردے - سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ - مرصع اور نرم و نازک صوفے - بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّ اَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا (۷۶/۱۵) چاندی کے برتن اور بلوریں آبخورے - غرضیکہ نَعِيْمًا وَّ مُلْكًا كَبِيْرًا (۷۶/۲۰) - عظیم مملکت اور اس میں سامانِ آسائش نہایت فراواں - اور پھر یہ سامانِ آسائش و آرائش کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہوگا - بلکہ ہر فردِ معاشرہ کے لئے یکساں - قرآن میں آپ شروع سے آخیر تک دیکھ جائیے - اس میں کہیں یہ نہیں لکھا ملے گا کہ جنتی زندگی کی یہ آسائشیں ایک خاص طبقہ کے لئے ہوں گی اور عوام ان سے محروم رہیں گے - قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں یہ تمام سامان ہر ایک کو میسر ہوگا - اس میں سب کا معیارِ زندگی اتنا بلند ہوگا، جنت کا کوئی گوشہ جہنم نہیں ہو سکتا۔
دنیا میں آپ تمام اخلاقی برائیوں پر غور کیجئے - ان کے اولین سرچشمے دو ہی نظر آئیں گے - یعنی افراط زر یا فلاکت و نکبت - افراطِ زر سے سرکشی و طغیانی کے فساد انگیز معائب ظہور پذیر ہوتے ہیں - اور نکبت و افلاس سے پستی و دنائت کے انسانیت کش عیوب و ذمائم - جب قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں نہ افراطِ زر ہوگا نہ افلاس و زبوں حالی، تو ظاہر ہے کہ اس میں ان سے پیدا ہونے والے عیوب و ذمائم کا بھی وجود نہیں ہوگا - حسد، کینہ، انتقام، تنگ نظری، حرص، ہوس، فریب کاریاں، مکاریاں، سازشیں ——— اور دوسری طرف بے حمیتی، بے غیرتی، ذلتِ نفس، تملق، خوشامد، منافقت وغیرہ - یہ سب عیوب معاشرتی ناہمواریوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں - جب یہ ناہمواریاں

ص؁ روس اور چین اب پلٹ کر نظامِ سرمایہ داری کی طرف آ رہے ہیں۔

مٹ جائیں تو ان وجوہ ننگِ انسانیت بدنہادیوں اور بدلگامیوں کا بھی وجود باقی نہیں رہتا۔ اس معاشرہ کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡہَا لَغۡوًا وَّ لَا تَاۡثِیۡمًا ۔ اس میں نہ لغویت اور بیہودہ پن ہوتا ہے، نہ کوئی ایسی حرکت جس سے کسی کے دل میں افسردگی و اضمحلال پیدا ہو۔ اِلَّا قِیۡلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (۵۶/۲۵-۲۶) اس میں ہر طرف سے سلامتی کو نشید دلنواز و آہنگِ روح افروز سنائی دیتی ہے۔ وَ نَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِہِمۡ مِّنۡ غِلٍّ ۔ (۷/۴۳)۔ ان کے سینے تمام ایسی کثافتوں سے پاک و صاف ہوں گے جنہیں انسان، غلط معاشرہ میں دل میں چھپائے رکھتا ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہوگی جسے ایک دوسرے سے چھپانے کی ضرورت پڑے۔ تکریمِ انسانیت اور احترامِ آدمیت وہاں کا عام اندازِ نگاہ ہوگا۔ وہاں نہ کوئی کسی کو ذلیل سمجھے گا نہ ذلیل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس معاشرہ کا انداز وہ ہوگا جس کا نقشہ اقبالؒ نے (جاوید نامہ میں) ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ؎

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش
خوبروئے و نرم خوئے و سادہ پوش

فکرشاں بے درد و سوزِ اکتساب — راز دانِ کیمیائے آفتاب!
کس ز دینار و درم آگاہ نیست — ایں بتاں را در حرم ہا راہ نیست
خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر — کارہا کس نمی سنجد بزر
سخت کش دہقاں چراغش روشن است — از نہابِ دہ خدایاں ایمن است
کِشت و کارش بے نزاعِ آبجو — حاصلش بے شرکتِ غیرے ازوست
اندراں عالم نہ لشکر نے فشوں — نے کسے روزی خورد از کشت و خوں
نے قلم در مصرعدیں گیرد فروغ — از فنِ تحریر و تشہیرِ دروغ

نے بہ بازاراں ز بے کاراں خروش
نے صداہائے گدایاں دردِ گوش

آخر میں اقبالؒ نے اس تمام تفصیل کو ایک شعر میں اس طرح سمٹا دیا ہے کہ اس کے بعد اس سلسلہ میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یعنی قرآنی مملکت وہ ہے کہ ؎

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

اِنَّ ہٰذِہٖۤ اُمَّتُکُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً ۫ۖ وَّ اَنَا رَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡنِ (۲۱/۹۲)۔ اوپر ایک خدا جس کی اطاعت کا قلادہ زیبِ گلو اور نیچے ساری اُمّت ایک صف میں دوش بدوش ایستادہ۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز۔ مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّؤۡتِیَہُ اللّٰہُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحُکۡمَ وَ النُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوۡلَ لِلنَّاسِ کُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّیۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ (۳/۷۹)۔ اس میں کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا خواہ اسے ضابطۂ قوانین اور حکومت، حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ مل جائے کہ وہ لوگوں کو اپنا محکوم بنائے اور ظاہر ہے کہ کسی کو محکوم بنانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اسے محتاج بنا دیا جائے۔ جب قرآنی مملکت میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوگا تو وہ کسی کا محکوم کس طرح سے ہوگا۔

اس قرآنی معاشرہ کی تشکیل کی ابتداء خود ارباب نظم و نسق کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا یہ قول، قولِ فیصل کا حکم رکھتا ہے کہ

اگر میں پیٹ بھر کر کھا پی کر مطمئن ہو جاؤں اور دیگر افرادِ معاشرہ بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں عوام کا اچھا رکھوالا نہیں ہوں۔ خدا کی قسم! اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر جائے تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

اور حضور نبی اکرمؐ کا یہ ارشادِ گرامی کہ

جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی رات بھوکے بسر کی تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے۔

اسی لئے قرآنی مملکت کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ اگر کسی بستی میں کوئی شخص بھوک سے مر جائے تو اس بستی کے باشندوں کو اس کا قاتل سمجھا جاتا ہے اور ان سے اس کا خون بہا وصول کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآنی مملکت کا یہ نظام اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے اور بحسن و خوبی چل سکتا ہے جب اس کے عمّال (کارندے) دیانتدار اور قابل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ بار بار اس قسم کی تاکیدی ہدایات جاری کرتے رہتے تھے

یاد رکھو! جس شخص کے سپرد امت کا کوئی اقتدار ہوا، اور پھر اس نے قابلیت کے بجائے اپنی محبت یا قرابت کی بنا پر کسی کو مسلمانوں کا حاکم بنا دیا تو اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ اور مسلمانوں سے غداری کی۔

اس باب میں ان کی احتیاط کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ انہیں ولایت کوفہ کے لئے ایک خاص ٹائپ کے کارکن کی ضرورت تھی جو بسیار کوشش کے باوجود مل نہیں رہا تھا۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جو ان خوبیوں کا مالک ہے، آپ اسے منتخب کر لیں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اس نے کہا کہ آپ کا بیٹا ...... عبداللہ ...... یہ سن کر انہوں نے کہا کہ قاتلک اللہ۔ خدا تجھے غارت کرے۔ تو مجھے یہ کس قسم کا مشورہ دے رہا ہے؟ عبداللہ ابن عمرؓ بیشک ان خوبیوں کے مالک تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ کو اس کا احساس تھا کہ اگر اس کی طرح پڑ گئی تو اس کا انجام کس قدر تباہ کن ہوگا۔ مملکت کے مناصبِ ارباب اقتدار کے اعزہ و اقارب میں بٹنے لگ جائیں گے۔ وہ عمّالِ حکومت کو تاکیداً لکھتے رہتے تھے کہ

سخت کوشی کی زندگی بسر کرنے کے عادی بنو۔ موٹا جھوٹا کھاؤ، گاڑھا گزی پہنو، پرانے کپڑے استعمال کرو۔ سواریوں کو خوب چارہ دو۔ ڈٹ کر گھوڑے کی سواری کرو اور جم کر تیر اندازی کرو۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں جو ہم دیکھتے ہیں کہ اُس دور میں حکومت کا کوئی کارندہ بددیانت اور رشوت خور نہیں تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قسم کے معاشی نظام میں کسی کو بددیانت بننے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ بددیانتی اور رشوت خوری کی ابتداء تو اس سے ہوتی ہے کہ حکومت کے ملازمین کو اپنے مستقبل کے متعلق ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا ہے۔ یہ عدم تحفظ (INSECURITY) کا احساس اور خدشہ ہے جو انہیں زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ اس کی ابتداء تو اس سے ہوتی ہے اور اس کے بعد زراندوزی کی ہوس انہیں آگے ہی آگے لئے چلی جاتی ہے۔ قرآنی مملکت کے نظام میں عدم تحفظ کا خیال تک نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس میں تمام افرادِ مملکت اور ان کے بچوں کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔ اس لئے کسی کو اس کی فکر ہی نہیں ہوتی کہ کل کو میرا یا میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا۔

اور نہ ہی اس میں جائدادیں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس نظام میں کوئی شخص بددیانت ہو نہیں سکتا۔ اسے بددیانت ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

محیر العقول کارنامے

اگلے دنوں میرے ایک فوجی دوست نے مجھ سے پوچھا کہ قرنِ اوّل میں مسلمان سپاہیوں (مجاہدین) نے جو محیر العقول کارنامے کر دکھائے، اس کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ میں نے کہا کہ ذرا اس پر غور کیجئے کہ وہ کون سے اسباب و احساسات ہیں جن کی وجہ سے ایک سپاہی میدانِ جنگ سے بھاگ جاتا یا کمزوری دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ میں مر جاؤں گا۔ اور دوسرا احساس یہ کہ میرے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ وہ تباہ ہو جائیں گے۔ قرآن نے یہ تصور دیا کہ موت صرف نقل مکانی کا نام ہے۔ کوئی انسان موت سے ختم نہیں ہو جاتا۔ وہ زندہ رہتا ہے۔ بس صرف مکان کی تبدیلی ہوتی ہے۔ (اسی لئے ہمارے ہاں موت کے لئے انتقال کا لفظ رائج تھا جو اس تصور کی ٹھیک ترجمانی کرتا تھا)۔ مسلمان سپاہی کے دل میں یہ تصور ایمان کی حیثیت لئے ہوتا ہے اس لئے اُسے موت کا ڈر ہی نہیں ہوتا۔ باقی رہا یہ دھڑکا کہ میرے مرنے کے بعد میری بیوی بچوں کا کیا ہوگا تو اس کی ذمہ داری پہلے ہی سے مملکت نے لے رکھی ہوتی ہے۔ لہٰذا، اسے یہ غم بھی نہیں ستاتا۔ اب سوچئے کہ جس سپاہی کو نہ موت کا ڈر ہو اور نہ ہی اپنے پسماندگان کے مستقبل کی طرف سے کسی قسم کا تردد۔ اس کے زورِ بازو کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اس کی تو نگاہ سے (اقبالؒ کے الفاظ میں) تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اگر روٹی کی فکر سے آزاد کر دیا جائے تو وہ "جن" بن جاتا ہے۔ اس کی وہ صلاحیتیں جو اس سے پہلے چکی کے اس پاٹ (MILL - STONE) کے نیچے بُری طرح سے دبی اور کچلی رہتی ہیں، اس طرح اُبھر کر باہر آتی ہیں کہ وہ کچھ اور کی اور مخلوق بن جاتا ہے۔ وہ صحیح انسانی پیکر میں سامنے آتا ہے۔ اس کی عظمتِ انسانیت چھلک کر باہر آجاتی ہے۔ اس کی ممکناتِ زندگی ایک ایک کر کے محسوس پیکر اختیار کر لیتی ہیں۔ وہ 'وہ کچھ' کر کے دکھا دیتا ہے جسے عام سطح کا انسان معجزات اور کرامات سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ کوئی معجزہ ہوتا ہے نہ کرامت۔ روٹی کے چکر میں پھنسا ہوا انسان، کبھی انسانی سطح پر نہیں آسکتا۔ اسے کسی انسانی مسئلہ کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے جو قرآن کریم نے حضرات انبیاء کرامؑ سے کہا کہ

یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا (۲۳/۵۱)

اے ہمارے رسولو! طیب رزق کھاؤ اور اعمالِ صالح کرو۔

آپ نے غور فرمایا کہ اعمالِ صالح اور روٹی کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یہ جو ہمارے ہاں ایک مذہبی افسانہ مشہور ہے کہ ابلیس نے آدم کو دانۂ گندم کھلا دیا جس سے وہ جنت سے باہر نکال دیا گیا تو اس سے کسی سیانے نے اسی طرف اشارہ تو نہیں کیا کہ انسان کو جنت سے نکلوانا مقصود ہو تو اسے روٹی کی فکر میں الجھا دو۔ اس کی تائید خود قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ اس نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بتایا ہے کہ آدم جس جنت میں رہتا تھا وہاں اسے روٹی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہاں اس کی کیفیت یہ تھی کہ ـــــ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) وہ جہاں سے جی چاہتا پیٹ بھر کر کھا لیتا۔ اس سے کہا گیا کہ یاد رکھو! اگر تم ابلیس کے فریب میں آ گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى (۲۰/۱۱۷)۔ تو وہ تمہیں اس جنتی زندگی سے نکلوا دے گا۔ اور تمہیں

اسی روٹی کی خاطر جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی۔ انسان اس کے فریب میں آگیا۔ جس کا نتیجہ سرمایہ دارانہ نظام تھا۔ اس سے بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶) کی انسانیت سوز جہنم وجود میں آگئی جس میں ہر فرد کا مفاد دوسرے فرد کے مفاد سے ٹکرانے لگا۔ انسان کو اس جہنم سے نکالنے کے لئے، آسمانی راہنمائی کا سلسلہ شروع ہوا۔

بعثت نبی اکرمؐ کا مقصد

قرآنِ کریم نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷)۔ یہ ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی اور اُس کے سر سے ان سِلوں کو اتار پھینکے گا جن کے نیچے وہ بُری طرح دبی ہوئی تھی۔ ان زنجیروں میں سب سے زیادہ سخت کڑی اور ان سِلوں میں سب سے زیادہ بوجھل، وہ خوف و ہراس تھا جو "روحانی قوتوں" کے نام سے انسان کے اعصاب پر سوار چلا آرہا تھا۔ اس سے اس میں جس قسم کی نفسیاتی الجھنیں (COMPLEXES) پیدا ہوتی تھیں۔ ہماری علمی دنیا اب اُن سے اچھی طرح روشناس ہو چکی ہے۔ قرآنِ کریم نے ختمِ نبوت کے اعلان سے اس بھارے بوجھ کو الگ کر کے رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ اب کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے آکر یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میں آسمان سے آیا ہوں اور تم زمینی مخلوق ہو۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اس باب میں سبقت کی۔

اب کوئی "فوق الفطرت عنصر، یا جسے عام طور پر روحانی قوت کہا جاتا ہے۔ انسانی زندگی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اس سے انسانی صلاحیتوں کو ابھرنے اور نشوونما پانے کا کُلی امکان حاصل ہو گیا۔ اور انسان کو پرکھنے کا معیار، شرفِ انسانیت (یعنی اس کی انسانی صلاحیتوں کی سطح) قرار پاگیا۔ اس حقیقت کو قرآنی معاشرہ کے اربابِ فکر و عمل کیسے اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے، اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے پیش کردہ اس معیار سے لگائیے جو ہمیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ملتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک دفعہ کوئی شخص آپ کے سامنے کسی مقدمہ میں پیش ہوا۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں اچھی طرح جانتا ہو۔ وہ ایک آدمی کو لایا حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم اس شخص کو اچھی طرح جانتے ہو۔ اس نے کہا، ہاں۔ تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو؟ اور اس کی اندر باہر کی زندگی سے واقف ہو۔ اس نے نفی میں جواب دیا۔ تو آپ نے کہا کہ تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے؟ اس کا جواب بھی نفی میں ملا۔ تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ لین دین کا معاملہ کیا ہے؟ اس نے اس سے بھی انکار کیا تو حضرت عمرؓ نے جو کچھ فرمایا وہ اس نکتہ کی اچھی طرح حقیقت کشائی کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ

پھر یوں نظر آتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں کھڑے کبھی سر جھکاتے اور سر اوپر اٹھاتے ہی دیکھا ہے۔

اس نے اقرار کیا تو آپ نے کہا کہ "چلے جاؤ۔ تم اسے خاک نہیں جانتے"۔ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں انسان

لہ ختمِ نبوت کے بعد "آسمانی آواز" قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ جو قیامت تک تمام نوعِ انسانی کے لئے مکمل ضابطۂ ہدایت ہے۔ اس کے علاوہ اب کوئی خدائی اتھارٹی نہیں بن سکتا۔

کی حیثیت سے جانتا ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی عطا فرمودہ نئی اقدار اور نبی اکرمؐ کے عدیم المثال عمل نے انسانیت کے ماپنے کے کس قدر نئے پیمانے عطا کر دیئے تھے۔ یہ وہ پیمانے تھے جن کی رُو سے انسان کی قدر و قیمت اس کی انسانی صلاحیتوں کی بناء پر متعین ہوتی تھی۔ اور ان صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ ان اقدار کی رُو سے ملتا تھا۔

نہ خوف نہ حُزن

وہ دوسری سِلیں جنہوں نے انسان کو بھُس کی طرح پیس رکھا تھا، چکی کے پاٹ تھے یعنی روٹی کی فکر —— قرآنی مملکت نے انسان کو اس فکر سے آزاد کر کے، اس محبوسِ قفس طائرِ لاہوتی کو آزادی کی حقیقی فضاؤں میں اذنِ بال کشائی دے دیا جس سے اُسے اپنی منزل آسمانوں میں نظر آنے لگی۔ قرآنِ کریم نے قرآنی مملکت کی خصوصیتِ کبریٰ یہ بتائی ہے کہ اس میں افرادِ معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ —— لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حُزن۔ یعنی وہ ہر قسم کے خوف اور حُزن سے مامون ہوں گے۔ خوف کے معنی تو ہم سمجھتے ہیں —— کسی آنے والے خطرہ کے احساس سے ہراساں ہونا۔ قرآنی مملکت میں کس قدر بے خوفی اور امن ہوتا ہے، اس کے متعلق نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نظام قائم کروں گا جس میں حالت یہ ہوگی کہ یمن سے ایک عورت تنہا صحراؤں اور بیابانوں سے سفر کرتی ہوئی شام تک چلی جائے گی اور اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔ بے خوفی اور امن کے ماپنے کا اس سے بہتر پیمانہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ باقی رہا وہ خوف جو زیردستوں کو بالادستوں کی طرف سے ہر وقت وجہ سوہانِ روح ہوتا ہے، سو اس کے متعلق وہ واقعہ سامنے لایئے کہ حضرت عمرؓ ایک دفعہ ایک وادی میں سے گزر رہے تھے کہ آپ نے یکایک سواری کو روکا، نیچے اُترے اور سجدے میں گر گئے۔ رفقاء نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کیا تو فرمایا کہ یہ وہ وادی ہے جس میں عمرؓ اپنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا۔ اور سہمے سہمے پھرا کرتا تھا۔ باپ بھی سخت تھا اور یونہی بات بات پر پیٹ دیا کرتا تھا۔ ایک وہ دن تھا، اور ایک یہ دن ہے کہ عمرؓ اور اس کے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں جس سے ڈرا جائے۔ یہ وادی دیکھ کر مجھے یہ احساس اس شدت سے ہوا کہ میں بے اختیار بحضور رب العزت سجدہ میں گر گیا۔

یہ ہوتا ہے قرآنی مملکت میں بے خوفی کا عالم۔ اس میں، خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہوتی جس سے ڈرا جائے۔ اور خدا کا ڈر بھی کسی مستبد حاکم کا ڈر نہیں ہوتا۔ خدا کے ڈر سے مراد ہوتا ہے اس نقصان اور تباہی کا احساس جو قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً جس طرح ہم دریا کے کنارے چلتے ہوئے، پاؤں پھسلنے کے انجام سے ڈرتے ہیں —— قرآنی مملکت میں قانون شکنی کے نقصان رساں نتائج کے احساس کے سوا کسی قسم کا خوف کسی کو نہیں ستاتا۔

باقی رہا حُزن، تو یہ لفظ بڑے گہرے معانی کا حامل ہے۔ عام طور پر اس کے معنی افسردگی اور اندوہناکی ہوتے ہیں۔ خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔ لیکن اسے بالخصوص اس افسردگی اور غمگینی کے لئے بولا جاتا ہے جو معاشی پریشانی کی وجہ سے حاصل ہو۔ سورۂ فاطر میں جنتی معاشرہ میں بسنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آئیں گے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۔ کس قدر قابلِ حمد و ستائش ہے خدا کا وہ نظام جس نے ہمیں حُزن سے نجات دلائی۔ عربی زبان کے مستند لغت، تاج العروس میں لکھا ہے کہ یہاں حُزن کے معنی ہیں صبح و شام کے کھانے کی فکر۔ اس کی تشریح خود اگلی آیت نے کر دی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اَلَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ

مِن فَضْلِهٖ لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ (۳۵/۳۴-۳۵) وہ خدا جس نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں ایسا معاشرہ عطا کر دیا ہے جس میں نہ کوئی جگر پاش مشقت ہے، نہ ذہنی کاوش و نفسیاتی افسردگی۔ نہ اس میں روٹی کے لئے مارے مارے پھرنا پڑتا ہے اور نہ ہی باہمی معاملات میں اس قسم کا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان خواہ مخواہ پریشان رہے۔ فکرِ معاش کی طرف سے آسودگی اور باہمی خوش معاملگی، یہ ہیں قرآنی مملکت کی بنیادی برکات و حسنات۔

قرآن کریم (میں سورۃ فاتحہ) کی ابتداء اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ سے ہوتی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا درخورِ حمد و ستائش اس لئے ہے کہ وہ کائنات کی نشوونما کرتا ہے۔ اور قرآن کی آخری سورت میں ربّ الناس کہا گیا ہے۔ یعنی پوری نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانے والا۔ جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے انسانی دنیا میں خدا کی یہ ذمہ داری اس مملکت کے ذریعے پوری ہوتی ہے جو اس کے نام سے قائم کی جاتی ہے۔ یہ مملکت بھی اس لئے مستحقِ حمد و ستائش ہوتی ہے کہ یہ افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرتی ہے اور ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو قطعاً مستحقِ تعریف و توصیف قرار نہیں پا سکتی۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت کے اربابِ بست و کشاد ہمیشہ اس فریضہ کی ادائیگی میں مصروفِ تگ و تاز رہتے ہیں۔ وہ سزاوارِ حمد و ستائش قرار ہی اس وقت پاتے ہیں جب وہ یہ کچھ کر کے دکھائیں۔ ان کے برعکس دوسرے اربابِ اقتدار کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (۳/۱۸۷)۔ ان کی ہر وقت یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی تعریف ان کاموں کی بناء پر کی جائے جنہیں وہ سرانجام نہیں دیتے۔ قرآنی مملکت میں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس میں یہ لوگ سب کچھ کر کے بھی کسی صلہ کی توقع یا ستائش کی تمنا نہیں رکھتے۔ اگر کوئی بے ساختہ ان کا سپاس گزار ہونا بھی چاہتا ہے تو وہ اس سے کہہ دیتے کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (۷۶/۹)۔ ہم، تم سے کسی معاوضہ کے تو ایک طرف، شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں۔

قرآنی مملکت کی خصوصیات کی تفصیل اتنی طویل ہے کہ اسے ایک نشست میں ختم نہیں کیا جا سکتا اس لئے میں آخر میں حضرت عمرؓ کے اس قول کو پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں جو میرے نزدیک اس باب میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم میں سے جب بھی کسی شخص کو کوئی شکایت ہوتی ہے تو وہ کسی ایسے دروازے کو تلاش کرتا ہے جس پر دستک دینے سے اس کی شکایت رفع ہو سکے اور جب وہ دُنیا کے تمام دروازوں کو بند پاتا ہے تو مجبور ہو کر اپنے خدا سے فریاد کرتا ہے۔ اسے دعا کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ایک خطبۂ عام میں کہا تھا کہ

لوگو! مجھے اللہ نے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک دوں۔

یعنی ایسا انتظام کر دوں کہ اوّل تو تمہیں کسی بات کے لئے خدا کے ہاں فریاد کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے اور اگر کبھی ایسا ہو جائے تو قبل اس کے کہ تمہاری شکایت خدا تک پہنچے، اس کا ازالہ ہو چکا ہو۔ یہ ہے قرآنی مملکت کی بنیادی خصوصیت اور یہی وہ امامتِ کبریٰ ہے جس کے حصول کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ امامت (لیڈرشپ) اس لئے کہ اس قسم کی مملکت کا وجود دنیا میں کہیں نہیں تھا۔ اس نئے پاکستان کی تشکیل سے یہ سبقت و امامت اسی کے حصّہ میں آنی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کا تصور دینے والے (اقبالؒ) نے، یہ تصور دیتے ہوئے کہا تھا کہ۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد   مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

پاکستان، اسی عالم افروز اور انسانیت ساز تصور کا حسین و جمیل پیکر بننے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔

لیکن

اور یہ "لیکن" ایک داستان ہے جگر گداز، اور ایک حدیث ہے دلخراش۔ اگر میں نے اسے بیان کرنا شروع کر دیا تو مجھے ڈر ہے کہ آپ یہ نہ کہہ دیں کہ ؎

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ   لو آج کی شب بھی سو چکے ہم

اس لئے میں اس خواب رُبا قصہ کی تفصیل میں جانے کے بجائے، اسے قرآن کے الفاظ میں کیوں نہ پیش کر دوں جن میں اختصار اور جامعیت معجزانہ حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ آپ سورۃ اعراف کی آیت ۱۷۵ سامنے لائیے جہاں سے بات کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِيٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ (۷/۱۷۵)

تم انہیں اس شخص کی عبرت آموز داستان (تمثیلاً) سناؤ جسے ہم نے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے تمام نشاناتِ راہ عطا کر دیئے تھے۔ لیکن وہ انہیں چھوڑ کر یوں الگ ہو گیا جیسے سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے کہ اس پر اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ ایسا اس لئے ہوا کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کے حصول اور پست جذبات کی تسکین کے پیچھے لگ گیا۔ اور یوں راہ سے بے راہ رو ہو گیا۔

ہم چاہتے تھے کہ وہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائے لیکن وہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ انفرادی مفاد پرستیوں کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔ ان ہوسناکیوں سے اس کی مثال کتے کی سی ہو گئی کہ اسے اکساؤ اور دوڑاؤ، تو بھی وہ ہانپے اور زبان لٹکائے اور اسے چھوڑ دو تو بھی ہانپے اور زبان لٹکائے۔ اس کا ہوکا کسی صورت میں کم ہی نہ ہو۔

ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ـــ یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین کا زبانی اقرار تو کرتی ہے لیکن عملاً انہیں جھٹلاتی ہے ـــ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ـ تم انہیں ان کی یہ داستان سناؤ۔ شاید یہ اس پر غور و فکر کریں اور سوچیں ہمارا ایسا حال کیوں ہو گیا؟ سَآءَ مَثَلَا الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا۔ اُف! کس قدر بُری حالت ہو جاتی ہے اُس قوم کی جو ہمارے قوانین کی عملاً تکذیب کرتی ہے۔ اس میں ہر ظلم و زیادتی کرنے والا سمجھتا ہے کہ میں دوسروں کو لوٹ کر اپنا فائدہ کر رہا ہوں۔ لیکن نہیں سوچتا کہ ـــ وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ (۷/۱۷۷) ـــ وہ اس طرح کسی دوسرے کا نہیں، خود اپنا ہی نقصان کر رہا ہے۔ جذبات پرستی کے طوفان میں غرق ہونے سے ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا۔ وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا۔ وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا۔ ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن انہیں کچھ سنائی نہیں دیتا۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ۔ تم انہیں انسان سمجھتے ہو؟ نہیں۔ یہ انسان نہیں، حیوان ہیں ـــ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ نہیں! یہ تو ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷/۱۷۹)۔ حیوان اپنی زندگی کے تقاضوں سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔ اور ان انسان نما حیوانوں کو خبر ہی نہیں کہ ان کی زندگی کے تقاضے کیا ہیں اور یہ کس طرف جا رہے ہیں ؎

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا   مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

نقد و نظر

جوہرِ تقویم

علمی نقطۂ نگاہ سے بھی، اور قرآن کی رو سے بھی، تاریخ کو جو اہمیت حاصل ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم تو اپنے دعاوی کی صداقت کے ثبوت میں اقوامِ سابقہ کی تاریخ کو بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ تاریخ کسی قوم کا حافظہ ہوتی ہے۔ جس طرح انفرادی حافظہ معدوم ہو جانے سے متعلقہ فرد کی شخصیت باقی نہیں رہتی، اسی طرح تاریخ کے معدوم ہو جانے سے اس قوم کی ہستی ختم ہو جاتی ہے۔ زندہ قومیں اسی لئے اپنی تاریخ کی حفاظت کا خاص اہتمام کرتی ہیں۔

تاریخ کی عمارت، سنین (کیلنڈر یا تقویم) کے ستونوں پر استوار ہوتی ہے۔ تقویم نہ صرف اپنی تاریخ کے لئے لابدّ ہوتی ہے بلکہ دوسری قوموں کی تاریخ کے تقابلی مطالعہ کے لئے بھی ناگزیر ہوتی ہے۔ اس باب میں ایک دقت سامنے آتی ہے۔ دیگر قوموں کے کیلنڈر شمسی ہوتے ہیں لیکن ہمارا کیلنڈر قمری ہے۔ اور شمسی اور قمری سالوں میں دنوں کا تفاوت اس تقابل میں الجھن پیدا کرتا ہے۔ اس مشکل کے حل کیلئے ایک مغربی محقق نے ایسا قاعدہ کلیہ مرتب کیا جس سے سن ہجری معلوم ہونے پر سن عیسوی معلوم کیا جا سکے۔ لیکن ہماری ضرورت یہ بھی تھی کہ ایسا قاعدہ مرتب ہو جس سے سن عیسوی سے سن ہجری معلوم کیا جا سکے۔ یہ کام جو مسلسل تحقیق، دیدہ ریزی اور کاوش کا متقاضی تھا کسی ادارہ کے کرنے کا تھا لیکن یہ دیکھ کر ہمیں حیرت (اور اس کے ساتھ بے حد مسرت) ہوئی کہ اسے ایک فرد نے تنہا سرانجام دے دیا ہے۔ اس کا نتیجہ، ضیاء الدین صاحب (لاہوری) کی جوہرِ تقویم کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اس میں عیسوی و ہجری سنین اور ان کی تقابلی تاریخوں کے علاوہ، عہدِ نبویؐ کی تقویم بھی شامل ہے، جو ایک نادر اور منفرد کوشش ہے۔ ہم محترم "قیس کو کہن" کو اس جوئے شیر پر مستحق صد تبریک و تہنیت سمجھتے ہیں۔ ان کی یہ محنت مؤرخین اور محققین کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوگی۔ اس میں البتہ ایک چیز نگاہ کو کھٹکتی ہے یعنی ..... دامانِ نگاہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار۔ ان کے پیش نظر (MATERIAL) بہت زیادہ تھا اور گنجائش کم۔ اس لئے انہیں باریک خط میں اسے سمونا پڑا۔ لیکن اس کی وجہ بھی ہم سمجھتے ہیں۔ اگر قلم جلی رکھا جاتا تو کتاب کی ضخامت بڑھ جاتی اور اس پر لاگت بھی زیادہ آتی۔ ہمیں تو اس پر بھی حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی اس کاوش کو اسقدر دیدہ زیب شکل میں پیش کرنے کی ہمت کیسے کر لی، بالخصوص اس لئے کہ انہیں معلوم ہوگا کہ ایسی بلند پایہ علمی تحقیقاتی کتابیں ناولوں کی طرح نہیں بکا کرتیں۔ اسکی قیمت پندرہ روپے فی جلد ہے جو اس کی محنت کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ الحقائق۔ آصف بلاک۔ علامہ اقبالؒ ٹاؤن لاہور۔

باسمہٖ تعالےٰ

ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ:

منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر! منزل پر قابض وہ ہو رہے ہیں جنہوں نے قدم قدم پر اس کے راستے میں روڑے اٹکائے تھے اور انتہائی کوشش کی تھی کہ یہ حاصل نہ ہونے پائے!!

(پرویز)

بتقریبِ یومِ پیدائشِ قائدِ اعظمؒ

خطاب

منزل اُنہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے!

عزیزانِ گرامی قدر! اسلام و رحمت۔

جو قوم اپنے محسنوں کی یاد تازہ نہیں رکھتی، اس میں محسن پیدا ہونے بند ہو جاتے ہیں۔ محسنین کی یاد تازہ رکھنے سے مراد یہ ہے کہ ان کے حسنِ کردار، ایثار اور خلوص کی مثالیں قوم کی نئی نسل کے سامنے رکھی جائیں تاکہ یہ اسی قسم کی خدمات سرانجام دینے کیلئے جذبۂ محرکہ بن سکیں۔ دورِ حاضر میں مسلمانانِ ہند و پاکستان کے محسنین کی صف میں تین شخصیتیں سرفراز نظر آتی ہیں ——— سرسیدؒ، علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ۔ آج کی نشست آخرالذکر کی یاد تازہ کرنے کے لئے منعقد کی گئی ہے۔

جیسا کہ آپ احباب کو معلوم ہے، میرے آج کے خطاب کا موضوع ہے:۔

"منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے"۔

لیکن، جیسا کہ آپ دیکھیں گے، بات اس سے بھی آگے چلی جاتی ہے۔ یہی نہیں کہ منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے، بلکہ یہ کہ منزل کی ملکیت کے دعویدار وہ ہیں جنہوں نے اس کے راستے میں بڑی بڑی رکاوٹیں کھڑی کی تھیں، اور آخردم تک اس کی مخالفت میں ایڑھی سے چوٹی تک کا زور لگاتے رہے تھے۔

مطالبۂ پاکستان کی مخالفت انگریز نے بھی کی تھی، اور ہندو نے بھی۔ لیکن ان کی کشمکش کا سلسلہ تقسیمِ ہند کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس لئے مجھے اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ میں ان کی ایک آدھ مثال دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ انگریز کی مخالفت کی مثال اس لئے کہ بعض لوگوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ تقسیمِ ہند یا مطالبۂ پاکستان انگریز کی سازش تھی۔ تحریکِ پاکستان کی کشمکش کے آخر میں لارڈ مونٹ بیٹن بطور وائسرائے ہند آیا تھا اور اسی کے ہاتھوں تقسیمِ ہند عمل میں آئی تھی۔ اس نے بی بی سی لنڈن سے نشر شدہ اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا:۔

لارڈ مونٹ بیٹن

میں ہندوستان گیا ہی اس مقصد کے لئے تھا کہ اُسے کسی طرح متحد رکھ سکوں۔ ہم صدیوں کے بعد اس ملک کو چھوڑ رہے تھے، ہم چاہتے تھے کہ اسے ایک متحد ملک کی شکل میں چھوڑ کر جائیں۔ اگر ایسا ہو سکتا تو یہ ایک عظیم کارنامہ ہوتا۔ اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہوجانا ایک الم انگیز حادثہ تھا۔ جس سے ہندوستان کی قوت پارہ پارہ ہوجاتی۔ لہٰذا میں نے اس مقصد کے لئے انتہائی کوشش کی، لیکن اس کی راہ میں ایک ایسا شخص حائل تھا جو پہاڑ کی طرح رکاوٹ بنے کھڑا تھا، اور وہ تھا مسٹر محمد علی جناح، صدر مسلم لیگ، جو شروع ہی سے "نہ" کہتا چلا گیا اور اس کے اس ارادہ کو بدلنے کیلئے میری ہر کوشش ناکام رہ گئی۔ مجھے بالآخر اس کے سامنے جھکنا پڑا۔ (طلوعِ اسلام فروری ۱۹۶۷ء)

ہندو کی طرف سے مخالفت کی دو ایک مثالیں پیش کرنے کا ایک اہم مقصد ہے۔ ہمارے ہاں ابھی تک وہ لوگ چلے آ رہے ہیں جو وقتاً فوقتاً یہ آواز بلند کرتے رہتے ہیں کہ قائداعظمؒ پاکستان میں اسلامی نظام نافذ نہیں کرنا چاہتے تھے، بلکہ اسے سیکولر ریاست بنانا چاہتے تھے۔ میں اس موضوع پر سینکڑوں، ہزاروں صفحات لکھ چکا ہوں۔ لیکن ان مثالوں سے یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہندو مطالبۂ پاکستان کا مقصد کیا سمجھتا تھا، اور وہ اس کی مخالفت کیوں کرتا تھا۔ قائداعظمؒ کا دعویٰ یہ تھا کہ اسلام میں مذہب (یعنی دین) سیاست ریاست اور حکومت سے الگ نہیں ہوتا۔ ہندوؤں کا سب سے بڑا لیڈر مسٹر گاندھی کہتا تھا

مسٹر گاندھی

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے، حکومت کو اس سے کیا واسطہ۔ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے...... مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔ (ہریجن ۱۹ دسمبر ۱۹۴۶ء)

وہ تو یہاں تک بھی کہتا تھا کہ اگر قائداعظمؒ مذہب کو درمیان میں نہ لائیں تو مطالبۂ پاکستان پر ان سے سمجھوتہ (COMPROMISE) بھی ہو سکتا ہے۔

اس نے کہا تھا۔

اگر مذہب کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے، یعنی ایک نجی کا معاملہ اور خدا اور بندے کے

درمیان ایک ذاتی تعلق، تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے، جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں، اور ان کی راہِ عمل بھی مشترک ہو۔ (ہندوستان ٹائمز مورخہ ۹ جولی ۱۹۴۰ء)

مسٹر منشی

یکم نومبر ۱۹۴۱ء کو لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس منعقد ہوئی، جس کی صدارت ہندوؤں کے مشہور رہنما مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:۔

تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سُنیے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنالیں جہاں طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے۔ اور جہاں اردو ان کی قومی زبان بن سکے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ پاکستان، مسلمانوں کا ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ (ٹربیون۔ مورخہ ۱۱/۲ ۲)

تقسیم کے بعد

ہندو تو تقسیم ملک کے بعد بھی یہ کوشش کرتے رہے کہ مسلمان، پاکستان کو سیکولر حکومت بنالیں۔ چنانچہ قائد اعظمؒ کی وفات کے بعد ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھا تھا:۔

پاکستان، بالخصوص مشرقی بنگال کی اقلیتوں کو اتنا خوف وہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا جتنا اس حقیقت سے کہ پاکستان کے رہنماؤں نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصول اور روایات کے مطابق اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد اس نے لکھا تھا:۔

اگر کشمیر کا مسئلہ پُر امن طریق سے طے ہوجائے اور پاکستان اسلامی سٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے، اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان، اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہوجائے گا۔

علماء کی طرف سے مخالفت:۔ میں نے ان مثالوں کا پیش کرنا ایک تو اس لئے ضروری

سمجھا جائے کہ جو اہل فریب حضرات کہتے رہتے ہیں کہ قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے، ان کے سامنے دشمنوں کی شہادت آجائے اور وہ دیکھ لیں کہ مسلمان تو ایک طرف ہندو بھی اسے بخوبی جانتا تھا کہ قائداعظمؒ پاکستان میں اسلامی سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے، اور ان کی طرف سے مخالفت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ اور دوسرے اس لئے کہ جن لوگوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی، ان کے متعلق یہ واضح ہو جائے کہ وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں تھے کہ پاکستان میں کس قسم کی حکومت قائم ہوگی۔ وہاں کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ مطالبۂ پاکستان سے مراد یہ ہے کہ وہاں اسلامی حکومت قائم کی جائیگی۔ اسے اچھی طرح جاننے کے باوجود وہ اس مطالبہ اور تحریک کی مخالفت کرتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ لوگ کون تھے؟ یہ تھے خیر سے ہمارے علماء حضرات! — آپ کو بھی اور آنے والے مورخ کو بھی اس سے تعجب ضرور ہوگا کہ اسلام کے یہ دعویدار ایک خالص اسلامی مطالبہ کی مخالفت کیوں کرتے تھے؟ اس کیوں کا جواب تو ذرا آگے چل کر آپ کے سامنے آئے گا۔ سردست اتنا دیکھ لیجئے کہ انہوں نے ساری تحریک کے دوران اس کی مخالفت کی، اور پوری شدت کے ساتھ مخالفت کی۔

دیوبندی علماء

اس زمانے میں ہندوستان میں علماء حضرات کی چار جماعتیں ممتاز حیثیت رکھتی تھیں — یعنی دیوبندی، بریلوی، مجلس احرار اور سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کی جماعت اسلامی۔ اثر اور وسعت کے اعتبار سے دیوبند کا دارالعلوم بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ وہاں کے فارغ التحصیل علماء، ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دیگر ممالک میں بھی پھیلے ہوئے تھے۔ وہاں کے شیخ الحدیث، مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نہ صرف ایک معلم کی حیثیت سے نامور تھے، بلکہ وہ ہزاروں، لاکھوں مولوی صاحبان کے مرشد طریقت بھی تھے۔ مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی ابتداء بھی انہی کی طرف سے ہوئی تھی، اور اسے انتہا تک بھی انہی کے متوسلین نے پہنچایا تھا۔ ان کی مخالفت کی داستان حیرت انگیز بھی ہے اور عبرت آموز بھی۔

قائداعظمؒ نے ۱۹۳۵ء کے اوائل میں تحریک پاکستان کا آغاز کیا۔ سب سے پہلا مرحلہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کا تھا۔ اس کیلئے انہوں نے سنٹرل پارلیمانی الیکشن بورڈ کی تشکیل کی۔ اس بورڈ میں مسلم لیگ کے ساتھ دیوبند کے ممتاز علماء، مثل مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم)، مفتی کفایت اللہ (مرحوم) مولانا احمد سعید (مرحوم) بھی شریک تھے۔ لیکن یہ حضرات اس سے مستعفی ہوگئے۔ یہ کیوں اور کیسے ہوا، اس کی تفصیل مرزا ابوالحسن اصفہانی (مرحوم) نے اپنی کتاب (QUAID-E- AZAM, AS I KNEW HIM) میں بڑے تأسف انگیز اور حسرت آمیز انداز میں پیش کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے :

لیگ سے علیحدگی

پارلیمانی بورڈ کے اجلاس میں بہت سی تقریریں ہوئیں۔ پہلے روز مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی تقریروں میں مسٹر جناح کی حمایت کرتے ہوئے اس بات کا خیر مقدم کیا کہ انہوں نے مسلم لیگ کو زندہ اور فعال سیاسی میدان میں داخل کر دیا۔ لیکن آخری روز ان میں سے ایک نے تجویز پیش کی کہ لیگ کو کامیاب کرانے کے لئے پراپیگنڈے کی مہم کا بڑی خوش اسلوبی اور سرگرمی سے چلانا ضروری ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ دیوبند کو اس پراپیگنڈے کا مرکز بنا دیا جائے۔ بشرطیکہ اس مہم کا تمام خرچ لیگ برداشت کرے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ پراپیگنڈے کی اس مہم کا آغاز کرنے کے لئے پچاس ہزار روپے کی ضرورت ہو گی۔ (صفحہ ۲۲۳)

اس کے بعد اصفہانی (مرحوم) لکھتے ہیں کہ اس وقت لیگ کے خزانے میں پچاس ہزار روپے تو ایک طرف، پچاس پیسے بھی نہیں تھے، اور ان مولانا حضرات کو اس کا بخوبی علم تھا۔ قائداعظمؒ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی اور کہا کہ اس وقت ہمیں خلوصِ نیت سے کام کا آغاز کر دینا چاہیئے، جب قوم میں اس کا احساس پیدا ہو گیا کہ ہمارا مؤقف حق پر مبنی ہے تو روپے کی کمی نہیں رہے گی۔ لیکن یہ حضرات اس سے مطمئن نہ ہوئے اور مسلم لیگ کو چھوڑ کر کانگرس کے آغوش میں جا پناہ لی۔ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نے یہ فتویٰ تک صادر فرما دیا کہ

فتویٰ

مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت حرام ہے، اور قائداعظمؒ کافرِ اعظم ہے۔

(طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۷۹ء صفحہ ۲۶)

بعض حقیقتیں افسانوں سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہوتی ہیں۔ اور یہ واقعہ انہی حقیقتوں میں سے ایک ہے۔ لیگ کے جیب میں پچاس ہزار روپیہ نہ ہونے نے ہندوستانی سیاست کا نقشہ الٹ کر رکھ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حصولِ پاکستان کے لئے اس قدر طویل طویل جنگ لڑنی پڑی۔ اس کے بعد بھی پاکستان ملا تو (بقول کسے) "لولا لنگڑا"! تقسیم ملک کے وقت مسلمانوں پر جو قیامت خیز تباہی آئی اس کے تصور سے آج بھی روح کانپ اٹھتی ہے۔ اور تشکیلِ پاکستان کے بعد اب تک یہ مملکت جس کشمکش میں گرفتار چلی آ رہی ہے، یہ سب اسی پچاس ہزار روپے کا کفارہ ہے جو قوم ادا کر رہی ہے، اور اس کے باوجود اسے

معافی نہیں مل رہی! غالب نے کہا تھا کہ:

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کیواسطے آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

لیکن ہمارا جرم تو ان کی نگاہ میں کفر سے بھی زیادہ ہے۔

بہر حال پچاس ہزار روپیہ نہ ملنے پر یہ لیگ سے الگ ہوئے اور اس کے بعد تحریک پاکستان کی مخالفت کے لئے میدان میں نکل آئے۔ ان حضرات کی پراپیگنڈے کی مشینری بڑی مؤثر اور حدود فراموش ہوتی ہے۔ قریہ قریہ گاؤں گاؤں، شہر شہر، محلہ محلہ میں مسجد ہوتی ہے، اور ہر مسجد میں ان کا مبلغ لاؤڈ سپیکر لئے بیٹھا ہوتا ہے۔ آپ سوچئے کہ مولانا مدنی (مرحوم) کی اس تبدیلیٔ مسلک نے کس طرح سارے ملک میں تحریک پاکستان کی مخالفت کا جال بچھا دیا۔ اور یہ سب پچاس ہزار روپے کے نہ ہونے کی وجہ سے ہوا! ان حضرات سے جب کہا جاتا کہ پاکستان کا مطالبہ تو اسلام کے تحفظ اور دین کی اقامت کے لئے کیا جا رہا ہے، تو یہ فرماتے کہ ہندوستان میں رہتے ہوئے اسلام پر کونسی قیامت ٹوٹ پڑیگی کہ اس کی حفاظت کے لئے جداگانہ مملکت کی ضرورت لاحق ہو۔ وہ فرماتے کہ،

ان علماء کا اسلام

کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی رہتی ہیں اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ پہنچے۔

(مولانا مدنی کا پمفلٹ "متحدہ قومیت اور اسلام" صفحہ ۶۱)

جہاں تک اسلامی حکومت کا تعلق ہے، ان کا ارشاد تھا کہ:

ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں، حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے، اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے۔

(زمزم مورخہ ۷ جولائی ۱۹۳۸ء)

مفتی محمود

ظاہر ہے کہ جب دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث کا یہ مسلک ہو، تو ان کے تلامذہ اور معتقدین کس طرح مطالبۂ پاکستان کے حامی ہو سکتے تھے! مرحوم مفتی محمود ان کی جماعت کے ایک اہم رکن تھے۔ وہ اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی باک نہیں سمجھتے تھے کہ انہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ مثلاً اخبار "نوائے وقت" نے اپنی اشاعت بابت ۷ ستمبر ۱۹۷۰ء کے اداریہ میں لکھا تھا۔

قومی اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود اپنے ایک خصوصی انٹرویو میں یہ کہہ چکے ہیں کہ وہ متحدہ ہندوستان میں زیادہ صوبائی خود مختاری میں مسلمانوں کا مفاد بہتر طور پر سمجھتے تھے، اس لئے تحریکِ پاکستان کے مخالف تھے۔

جمعیتِ علماءِ پاکستان کے اس زمانے کے سینئر نائب صدر سید محمود شاہ گجراتی نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا:-

مولانا مفتی محمود نے خود (۸-۸-۹ء) کے ایک اجلاس میں کہا تھا کہ وہ پاکستان کو قائم کرنے کے گناہ میں شامل نہیں تھے۔

(روزنامہ مشرق مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۷ء)

بریلوی حضرات

دیوبندی علماء کے بعد ہم بریلوی حضرات کی طرف آتے ہیں، جن کا دعویٰ ہے کہ امت کا سوادِ اعظم انہی پر مشتمل ہے۔ (پاکستان میں اس وقت ان کے نمائندہ مولانا نورانی ہیں) علامہ اقبالؒ، قائدِ اعظمؒ اور تحریکِ پاکستان کے خلاف ان کے علماء نے جو فتوے شائع کئے تھے، وہ تاریخ میں محفوظ ہیں، مثلاً "تجانب اھل السنۃ عن اھل الفتنۃ" ان کی ایک مشہور کتاب ہے؛ اس میں علامہ اقبالؒ کے خلاف کئی صفحات سیاہ کرنے کے بعد لکھا ہے:-

ڈاکٹر صاحب کی زبان پہ ابلیس بول رہا ہے۔ ان کے مذہب کو سچے دینِ اسلام کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ (صفحہ ۴۰-۱۴۳، ۲۴۱)

اس میں قائدِ اعظمؒ کے متعلق ارشاد ہے:-

بحکمِ شریعت مسٹر جناح اپنے ان عقائد کفریہ قطعیہ، یقینیہ کی بناء پر قطعاً مرتد، اور خارج از اسلام ہے۔ جو شخص اس کے کفروں پر مطلع ہونے کے بعد اس کو مسلمان جانے یا اسے کافر نہ مانے، یا اس کے کافر مرتد ہونے میں شک رکھے، یا اس کو کافر کہنے میں توقف کرے، وہ بھی کافر مرتد اور شرالانام ہے۔ اور بے توبہ مرا تو مستحقِ لعنتِ عزیز علام ہے۔ (صفحہ ۱۲۲)

اسی فرقہ کے ایک ممتاز عالم، مولانا اولادِ رسول نے ایک رسالہ "الجوابات السنیہ" شائع کیا تھا، اس میں حزب الاحناف (لاہور) کے مولانا ابوالبرکات سید احمد صاحب کا یہ فتویٰ درج تھا کہ:-

لیگ کی حمایت کرنا، اس میں چندے دینا، اس کا ممبر بننا، اس کی اشاعت و تبلیغ

کرنا منافقین و مرتدین کی جماعت کو فروغ دینا ہے۔

مجلس احرار

اب آیئے مجلس احرار اسلام کیطرف جو اس زمانے میں کانگریس کی ہمنوا تھی اور ملک میں اس کا بڑا شور تھا۔ قائدِ اعظمؒ نے ایک پارسی نژاد خاتون سے، اس کے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد، شادی کی تھی۔ اس واقعہ کا اخبارات میں بڑا چرچا ہوا تھا۔ مجلسِ احرار کے ایک ممتاز لیڈر، مولانا مظہر علی اظہر نے قائدِ اعظمؒ کے خلاف جھوٹ تراشا اور بڑی جرأت اور بے باکی سے یہ شعر عام کیا کہ،

اک کافرہ کے واسطے اسلام کو چھوڑا
یہ قائدِ اعظمؒ ہے کہ ہے کافرِ اعظم!

اسی مجلس احرار کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۹ مارچ ۱۹۴۶ء میں ایک قرارداد پاس کی جس میں کہا تھا :

یہ اجلاس ایک بار پھر اعلان کرتا ہے کہ مسلم لیگ کی قیادت قطعی غیر اسلامی ہے۔

مودودی مرحوم

اب ان عناصر اربعہ کے آخری مہرہ کی طرف آیئے ——— یعنی مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ (مرحوم) کی طرف جنہوں نے قائدِ اعظمؒ اور تحریکِ پاکستان کی مخالفت کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا تھا۔ وہ کسطرح حیدر آباد دکن سے پنجاب آئے، کسطرح پہلے لیگ کے حلقہ میں اپنی مقبولیت پیدا کی، اور پھر مخالفت پر اتر آئے، یہ داستان، جو میرے ذاتی علم پر مبنی ہے (ان کے ساتھ میرے مراسم پہلے سے چلے آرہے تھے)، بڑی دلخراش ہے جس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔ میں ان کی مسلسل مخالفت کی صرف چند ایک مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

سیاسی کشمکش

ادھر آنے کے بعد مودودی صاحب (مرحوم) نے تین حصوں میں ایک کتاب شائع کی جس کا عنوان تھا "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش"۔ اس کے پہلے دو حصوں میں ایسے مضامین ہیں جن کی بناء پر وہ مسلمانوں میں مقبول ہوئے تھے، اور تیسرا حصہ مسلم لیگ، مطالبۂ پاکستان

اور قائداعظمؒ کی مخالفت سے بھرا پڑا ہے۔ مطالبۂ پاکستان سے مراد ہی ایک اسلامی مملکت کا قیام تھا، اور اسی وجہ سے مسلمانانِ ہند اِس تحریک میں فوج در فوج شامل ہو رہے تھے۔ اِس کے ساتھ ہی اُن کی وفاداریوں کا مرکز قائداعظمؒ کی ذات تھی جو سیرت اور کردار کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھی۔ اُن کی دیانت اور امانت، جرأت اور صداقت کے اُن کے دشمنوں تک معترف تھے۔ اِس تحریک کو ناکام بنانے کا ایک ہی طریقہ تھا اور وہ یہ کہ قائداعظمؒ کو عوام کی نظروں سے گرا دیا جائے۔ چنانچہ مودودی (مرحوم) بتکرار و اصرار چرچا کرتے رہتے تھے:-

قائداعظمؒ کے خلاف

لیگ کے قائداعظمؒ سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو، اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ (حصہ سوم صفحہ ۳۷) ایسے لوگوں کو محض اس لئے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرزِ تنظیم کے استادِ فن ہیں اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں، سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے۔ (حصہ سوم صفحہ ۷) ان لوگوں کی عملی زندگی اور ان کے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جاسکتی (حصہ سوم صفحہ ۴۷)

اسی کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں:-

نہ ان کی جماعت اسلامی مفہوم کے اعتبار سے جماعت ہے، نہ ان کی امارت اسلامی اصطلاح کی رُو سے امارت ہے، نہ ان کی اِس امارت کو کسی حیثیت سے بھی سمع و طاعت کا حق پہنچتا ہے۔ محض لفظ "مسلمان" سے دھوکہ کھا کر جو لوگ جاہلیت کے پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اِس نوعیت کی کوئی تنظیم اسلامی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہوگی، اُن کی کند ذہنی ماتم کی مستحق ہے۔ (حصہ سوم صفحہ ۸۲)

وہ کہتے تھے کہ:-

جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہیہ قائم ہو جائے گی، اُن کا گمان غلط ہے۔ دراصل اِس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا، وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ (ترجمان القرآن بابت محرم ۱۳۶۰ھ)

اُن سے کہا جاتا ہے کہ اس وقت مطالبہ فقط ایک الگ خطۂ زمین حاصل کرنے کا ہے تاکہ اس میں

اسلامی حکومت قائم کی جا سکے۔ وہ خطۂ زمین حاصل ہو گیا تو آپ اس میں اپنے تصوّر کی اسلامی حکومت قائم کر لیجئے گا۔ اس کے جواب میں وہ کہتے :۔

بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی ہی سہی، مسلمانوں کا قومی سٹیٹ تو قائم ہو جائے، پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے سے اس کو اسلامی سٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے۔ اس کی بناء پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں، اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو معجزہ سمجھوں گا۔
(حصّہ سوم صفحہ ۱۶۸)

اسی بناء پر وہ کہتے تھے کہ

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں، وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔ ..... میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپیریل ازم سے آزاد کرایا جائے۔
(حصّہ سوم صفحہ ۹۴-۹۲)

وہ آخری وقت تک اس لئے اور اسی سُر میں تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرتے رہے۔ اوائل ۱۹۴۷ء میں جب تقسیم ملک کے آثار نمایاں ہونے لگے تو انہوں نے ان صوبوں کا رُخ کیا جہاں مسلمان اقلیت میں تھے تاکہ یہ کہہ کر کہ پاکستان بننے کے بعد تمہارا یہاں کیا حشر ہوگا، ان کے جذبات کو مشتعل کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ٹونک، مدراس اور پٹنہ میں جماعت کے خصوصی اجلاس منعقد کئے۔ ٹونک کے اجلاس میں خود ان کی جماعت کے ایک صاحب نے مودودی صاحب سے کہا کہ جب مسلم لیگ کا مطالبہ مسلمانوں کے لئے ایک اسلامی مملکت حاصل کرنے کا ہے تو پھر کونسا امر مانع ہے کہ ہم اس کا ساتھ نہ دیں۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا :۔

جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں، تو پھر کس منہ سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیا جائے۔ (روئیداد جماعت اسلامی حصّہ پنجم صفحہ ۶۵)

پٹنہ کے ایک اجلاس میں ان کی جماعت کے ایک ممتاز رکن ملک نصر اللہ خان (مرحوم) نے کہا:

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اقامت دین کے آغاز سے پہلے زمین کا ایک خطہ حاصل کر لینا ضروری ہے جہاں دین کو برپا کر سکیں۔ حیرت ہے کہ یہ چیز خاصے سمجھدار اور بظاہر معقول اور عالم دین لوگوں کی طرف سے کہی جاتی ہے ...... حکومت کے قیام کے لئے

آپ کو اینٹ اور گارے کی ضرورت نہیں کہ آپ قطعاتِ زمین تاکتے پھریں
(ایضاً صفحہ ۱۵۲)

مخالفت کی وجہ

یہ تھی مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی ایک خفیف سی جھلک جو ہندوستان میں علماء حضرات کی طرف سے کی گئی تھی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب علامہ اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ کی طرف سے بار بار واضح اور غیر مبہم الفاظ میں یہ کہا جاتا تھا کہ پاکستان کا مطالبہ کیا ہی اس لئے جا رہا ہے کہ اسے اسلامی مملکت بنایا جا سکے، تو پھر ان مذہبی رہنماؤں کی طرف سے اسکی مخالفت کیوں ہوتی تھی؟ اس کی خاص وجہ تھی۔ علامہ اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ بار بار اعلان کرتے تھے کہ اسلامی مملکتِ پاکستان میں مذہبی پیشوائیت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ مملکت کے اقتدار میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ علامہ اقبالؒ نے مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی (مرحوم) کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا:۔

> آپ نے ٹھیک فرمایا ہے کہ پیشہ ور مولویوں کا اثر سرسید احمد خاںؒ کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا، مگر خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹیکل فتووں کی خاطر ان کا اقتدار ہندی مسلمانوں میں پھر قائم کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔　　(انوارِ اقبال صفحہ ۲۱۷)

انہوں نے ۱۹۳۲ء میں اپنے ایک بیان میں جو روزنامہ انقلاب لاہور کی ۲۳ مارچ کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:۔

> تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری مُلّاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے، اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانۂ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے۔ تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائیں۔

اقبالؒ کا سارا کلام مذہبی پیشوائیت کی گرفت کے خلاف چیلنج ہے۔ وہ تو اس تیرہ بخت قوم کو پکارتا ہی یہ کہہ کر ہے کہ:

اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری

قائداعظمؒ

قائداعظمؒ نے واضح تر الفاظ میں اس حقیقت کو بیان کر دیا۔ انہوں نے تحریک کے آغاز ہی میں (۱۹۳۸ء میں) مسلم یونیورسٹی (علیگڑھ) کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے نوجوانوں سے کہا تھا:

مسلم لیگ نے کم از کم ایک کام تو کر دیا ہے، اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں مسلمانوں کے رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے...... اس میں شک و شبہ نہیں کہ اس نے تمہیں اس ناخوش آئند طبقہ کی جکڑ بندیوں سے آزاد کرا دیا ہے۔ جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔ (تقاریر جلد اول صفحہ ۴۸)

انہوں نے مسلم لیگ کنونشن منعقدہ دہلی (۱۱ اپریل ۱۹۴۶ء) میں واضح الفاظ میں کہا تھا:۔

اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ لڑائی لڑ رہے ہیں، ہمارا نصب العین کیا ہے۔ یاد رکھئے! ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں، ہم تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔

انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں بحیثیت گورنر جنرل اہل امریکہ کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا تھا:۔

پاکستان میں کسی قسم کی تھیاکریسی کارفرما نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

بناءِ مخالفت

اس سے آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ یہ حضرات مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کیوں کرتے تھے۔ جس مملکت میں ان کا کوئی عمل دخل ہی نہ ہو، اس کی مخالفت نہ کی جائے تو اور کیا کیا جائے۔ ہندوستان کی سیکولر مملکت میں کم از کم مسلمانوں کے شخصی معاملات کا اقتدار تو ان کے ہاتھ میں رہتا تھا، خود مودودی صاحب "پاکستان کے ذرا سے کونے" کے مقابلے میں ہندوستان کی وسیع و عریض سلطنت کو ترجیح دیتے تھے۔ انہوں نے اپریل ۱۹۴۷ء میں ٹونک کے اجلاس میں کہا تھا:۔

یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں، لیکن اگر یہ فی الواقع خلوصِ قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان، پاکستان بن سکتا ہے، اور اس میں لادینی جمہوری حکومت یا عوامی پارلیمنٹری حکومت نہیں بلکہ خالص خدا کی حکومت، کتاب و سنت کے اصولوں پر قائم ہو سکتی ہے۔ (روئیداد جماعت اسلامی حصہ پنجم صفحہ ۶۵)

مودودی صاحب ایسے بچے نہیں تھے جو یہ بھی نہ سمجھتے کہ ہندوستان میں خدا کی حکومت کا قائم کرنا تو ایک طرف، اس کا نام تک لینے کی بھی اجازت نہیں ہوگی۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ ہندو، اہل پاکستان سے کہتے تھے کہ تم خدا کی حکومت کا خیال ترک کر دو تو تم سے مفاہمت کی کئی راہیں نکل سکتی ہیں؟ اس حقیقت کی موجودگی میں یہ کہنا کہ ہندوستان میں خدا کی حکومت قائم ہو سکتی تھی خود فریبی نہیں تو ابلہ فریبی ضرور تھی۔ ان سے کون پوچھتا کہ اگر ایسا ہی تھا تو آپ وہاں سے اِدھر کیوں چلے آئے، سارے ہندوستان میں خدا کی حکومت قائم کرنے کے لئے اُدھر ہی کیوں نہ رہے؟

پاکستان بن گیا

ان کی پیہم مخالفتوں کے باوجود پاکستان متشکل ہو گیا۔ اس سے انکی سوچ کے رُخ میں بھی تبدیلی آگئی۔ انہوں نے دیکھا کہ اقبالؒ مدت ہوئی وفات پا چکا ہے اور قائداعظمؒ یوں سمجھئے گویا، زندگی کے آخری دن گن رہے ہیں۔ ان کے بعد ملک میں کوئی ایسی قدآور شخصیت نظر نہیں آتی جو ان کے عزائم میں روک بن سکے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی سیاسی دُوررس نگاہ مودودی صاحب ہی کی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ وہ وہاں سے اٹھے اور اپنے رفقاء سمیت سیدھے لاہور آگئے۔ پٹھانکوٹ کا علاقہ جہاں ان کا ہیڈ کوارٹر تھا، ہندوؤں کا گڑھ تھا۔ اس کے باوجود (خود اس جماعت کے اپنے بیان کے مطابق) یہ بحفاظت وہاں سے منتقل ہو گئے، اور ان کا بال تک بیکا نہ ہوا، حالانکہ اس زمانے میں شاید ہی کوئی مسلمان گھرانہ ایسا ہو جو مشرقی پنجاب سے بحفاظت پاکستان پہنچ گیا ہو۔

پاکستانی بیوروکریسی کے ساتھ مودودی صاحب کے پہلے سے مراسم تھے۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں (جو اخبار تسنیم کی ۶ جنوری ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں چھپا تھا۔) کہا تھا!

بیوروکریسی کے ساتھ تعلقات

> چودھری محمد علی صاحب سے میرے ذاتی تعلقات پندرہ سولہ برس پرانے ہیں، اور برادرانہ حد تک ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے بھی وہ میرے ہاں تشریف لاتے تھے، اور میں ان کے ہاں جاتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی وہ ہمیشہ مجھ سے ملتے رہے ہیں..... میں جب کبھی کراچی جاتا ہوں، ان سے دو ایک ملاقاتیں ضرور ہوتی ہیں، اور چونکہ رات ہی کا وقت میری اور ان کی فرصت کا ہو سکتا ہے، اس لئے ملاقات رات ہی کے وقت ہوتی ہے۔

ان تعلقات کا نتیجہ تھا کہ ریڈیو پر ان کی تقاریر کا اہتمام کیا گیا اور پاکستان کے بڑے بڑے

شہروں میں ان کے جلسے بھی ہونے لگے، حالانکہ وہ یہاں آکر بھی قائداعظمؒ کی تحقیر برابر کئے جاتے تھے۔ مثلاً ان کے ماہنامہ ترجمان القرآن کا پہلا پاکستانی پرچہ جون ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے تحریکِ پاکستان کے متعلق تفصیلی بحث کرنے کے بعد لکھا تھا۔

تحقیر اور نفرت

> یہ بحث ان سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلے رُبع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔

پھر انہوں نے اگست ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں مسلم لیگ کے تذکرہ کے بعد لکھا۔

> یہ ساری جماعت بازی گروں سے پٹی پڑھی تھی جنہوں نے عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بےبصیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا، اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندہ بنے ہوئے تھے۔

نمازِ جنازہ

واضح رہے کہ اس زمانے میں قائداعظمؒ پاکستان کے گورنر جنرل بھی تھے۔ ان کے خلاف مرحوم مودودی صاحب کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے قائداعظمؒ کی نمازِ جنازہ بھی نہیں پڑھی تھی۔ ایک دفعہ میاں طفیل محمد اور پروفیسر غفور احمد صاحب نے ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن سرگودھا کے اجتماع میں ایک سوال کے جواب میں کہا تھا:

> مولانا مودودی اور خود انہوں نے قائداعظمؒ کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی تھی[1] ان سے جب پوچھا گیا کہ کیا مولانا مودودی نے بھی قائداعظمؒ کو اپنا قائد تسلیم کیا تھا؟ تو یہ جواب دیا گیا کہ مولانا مودودی خود قائد ہیں۔ اس لئے وہ قائداعظمؒ کو اپنا قائد کیوں مانتے۔ (مساوات مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۷۰ء)

واضح رہے کہ مودودی صاحب نے علامہ اقبالؒ کی نمازِ جنازہ میں بھی شرکت نہیں کی تھی حالانکہ علامہ کے مودودی صاحب پر دیگر احسانات کو تو چھوڑیئے، مودودی صاحب نے انہیں اپنا "مادی سہارا" کہا تھا۔

آپ دیکھ چکے ہیں کہ مودودی صاحب نے تحریکِ پاکستان کے آخری مرحلہ تک اسے غیر اسلامی تحریک کہا تھا اور بار بار اعلان کیا تھا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں کہ پاکستان بنتا ہے یا نہیں۔ لیکن یہاں پہنچنے کے بعد انہوں نے بلا جھجک یہ کہنا شروع کر دیا کہ

---

[1] چودھری محمد ظفراللہ خان (قادیانی) نے بھی قائدِاعظمؒ کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی تھی۔

ہم نے مسلمانوں کے قومی تحفظ کے لئے کوشش کی، تو اس لئے نہیں کہ دوسری قوموں کی طرح اس قوم کا بھی امتیازی وجود قائم رہے، بلکہ صرف اس لئے کہ یہ قوم دنیا میں حق کی شہادت ادا کرنے کے لئے زندہ رہے۔ ہم نے ایک آزاد مملکت کا قیام چاہا تو اس غرض سے نہیں کہ روئے زمین پر ایک اور ترکی یا ایک اور مصر، یا ایران کا اضافہ ہو جائے، بلکہ صرف اس غرض سے کہ ایک خالص اسلامی ریاست قائم ہو جو اسلامی نظام کا مکمل نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرے۔

(ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۵۰ء)

مودودی صاحب کے اس اعلان میں آپ ان الفاظ پر غور کیجئے کہ "ہم نے مسلمانوں کے قومی تحفظ کے لئے کوشش کی" یا یہ کہ "ہم نے ایک آزاد مملکت کا قیام چاہا" اور پھر سوچئے کہ یہ وہی مودودی صاحب ہیں جو ابھی کل تک یہ کہہ رہے تھے کہ انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ مسلمان الگ قوم کی حیثیت سے زندہ رہتے ہیں یا کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جاتے ہیں، یا یہ کہ تحریک پاکستان غیر اسلامی تحریک ہے۔

نئی ٹیکنیک :-

بہر حال یہاں آنے پر انہوں نے اس طرح اپنے پاؤں جمانے شروع کئے۔ ان کے بعد دیوبندی اور بریلوی فرقوں سے متعلق حضرات بھی گروہ در گروہ ادھر آنا شروع ہو گئے۔ ان کے باہمی اختلافات کتنے ہی شدید کیوں نہ ہوں انہوں نے متفقہ طور پر کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، اس لئے اس کی باگ ڈور ہمارے ہاتھ میں دو کیونکہ ہم ہی جانتے ہیں کہ اسلام کیا ہے۔ اس کے لئے انہوں نے ٹیکنیک ایسی اختیار کی کہ قانون سازی کا ایسا فارمولا دیا جائے جس کی رُو سے کوئی حکومت اسلامی قوانین کا متفق علیہ ضابطہ مرتب ہی نہ کر سکے۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں مختلف فرقوں کے (۳۱) علماء نے یہ فارمولا مرتب کیا کہ ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو۔ ان میں سرِ فہرست خود مودودی صاحب تھے جو اچھی طرح جانتے تھے کہ اس فارمولا کی رُو سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں۔ کسی متفق علیہ ضابطۂ قوانین کا مرتب ہونا تو ایک طرف رہا، ان کے باہمی اختلافات کی شدت کا یہ عالم ہے کہ مفتی محمود (مرحوم) نے حیدر آباد پریس کلب میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

مفتی محمود کا فتویٰ :

مودودی صاحب نے جمعیت العلماء کے مولویوں کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ مودودی کو فتویٰ

دینے کا حق حاصل نہیں، فتویٰ دینے کا حق مجھے ہے۔ میں اب تک پندرہ ہزار فتوے دے چکا ہوں، اور وہ سب مجلد کتابوں میں موجود ہیں۔ میں آج اس پریس کلب میں فتوےٰ دیتا ہوں کہ مودودی گمراہ، کافر اور خارج از اسلام ہے۔ اس کے اور اس کی جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی مولوی کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز اور حرام ہے۔ اس کی جماعت سے تعلق رکھنا کفر اور ضلالت ہے۔ وہ امریکہ اور سرمایہ داروں کا ایجنٹ ہے۔ اب وہ موت کے آخری کنارے پہ پہنچ چکا ہے۔ اور اب اسے کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اس کا جنازہ نکل کر رہے گا۔

(ہفت روزہ زندگی لاہور۔ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۶۹ء)

الگ نمازیں

مودودی اور غیر مودودی تو ایک طرف رہے، دیوبندی اور بریلوی حضرات بھی ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے، حالانکہ یہ دونوں فرقے سنی اور حنفی ہیں۔ مولانا نورانی نے تو ایک دفعہ صدر مملکت جنرل ضیاء الحق سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ امام حرم کے پیچھے بھی نماز نہیں پڑھتے۔ آپ سوچئے کہ جس "کتاب وسنت" کی رُو سے یہ حضرات اپنی نمازوں تک میں بھی متفق نہیں کیا وہ اُسی "کتاب وسنت" کی رُو سے مملکت کے لئے ایک متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب کر سکتے ہیں؟ (واضح رہے کہ ہم نے ابھی شیعہ اور اہل حدیث حضرات کے اختلافات کا ذکر نہیں کیا) یہ حضرات یہ سب کچھ جاننے کے باوجود ہر حکومت سے یہ تقاضا کرتے رہے کہ وہ "کتاب وسنت" کے مطابق ضابطۂ قوانین مرتب کرے۔ اور جب کوئی حکومت ایسا نہ کر سکی تو ان حکومتوں کے خلاف مسلسل پروپیگنڈا جاری رکھا کہ یہ لوگ مغرب پرست، بے دین اور ملحد ہیں، یہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانا ہی نہیں چاہتے۔

ناممکن ہے

یہ پروپیگنڈا جاری رہا تا آنکہ مرحوم مودودی صاحب کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ :۔

کتاب وسنت کی رُو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق طور پر اسلامی قرار پا سکے۔

(ایشیا مورخہ ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

جب ان سے کہا گیا کہ اس کا علاج کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ ملک میں فقہ حنفی رائج کر دی جائے، یعنی کتاب وسنت کی بناء پر تو تمام فرقے متفق نہیں ہو سکتے، فقہ حنفی پر سب متفق ہو جائیں گے جو ایک فرقہ کی فقہ ہے۔ اور جیسے خود مودودی صاحب "مجتہد نا سنر" قرار دیتے تھے۔

مقصد واضح تھا کہ "نہ نومن تیل ہوگا نہ رادھا ناچیگی"!

جب اس سے اختلافات اور بڑھ گئے اور ان سے پوچھا گیا کہ اس مشکل کا حل کیا ہے ؟ تو انہوں نے وکلاء کانفرنس میں کہا :-

اقتدار ہمیں دو :

میں واضح طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلامی قوانین کا نفاذ اگر ہوسکتا ہے تو صرف اسی طرح ہوسکتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے ان کو اقتدار سے ہٹایا جائے اور ملک کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہیں اور دل سے مانتے بھی ہیں، اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ موجود ہیں، اور جس روز ان کے ہاتھ میں اقتدار آئے گا۔ اس کے دوسرے روز اسلامی احکام نافذ ہو جائیں گے (ایشیا مورخہ ۹ مئی ۱۹۷۷ء)

اس کے بعد انہوں نے انتقال اقتدار کے لئے باقاعدہ تحریک کی سکیم وضع کی۔ وہ تحریک یوں تو اپنے پاؤں چلتی رہتی لیکن مسٹر بھٹو (مرحوم) کی ایک بے وقت تقریر نے اُسے برق رفتار بنا دیا۔ انہوں نے ۲۱ دسمبر ۱۹۷۶ء کو قائداعظم کے صد سالہ جشنِ ولادت کے سلسلے میں منعقدہ وفاقی پارلیمان اور سینٹ کے مشترکہ اجلاس میں دیوار پر لٹکی ہوئی قائداعظم کی تصویر کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا :-

مسٹر بھٹو کی تقریر :

اے قائداعظم! مجھے معلوم ہے کہ (جہاد پاکستان کے دوران) آپ کا سینہ کس کس قسم کے تیروں اور نشتروں سے چھلنی کیا گیا۔ انگریز نے آپ کو مغرور کہا، یہ بات قابلِ فہم تھی کیونکہ آپ نے اس کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ اس کی شان و شوکت سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ کانگریسی لیڈروں اور ان کے متبعین نے آپ کو ضدی کہا، یہ بات بھی قابلِ فہم تھی کیونکہ آپ ان کے دامِ فریب میں نہیں پھنستے تھے۔ لیکن جو بات قطعاً قابلِ فہم نہیں، جس بات نے آپ کو یقیناً پریشان اور ہراساں کر دیا ہوگا یہ تھی کہ جس قوم کی خاطر آپ غیروں کی طرف سے یہ سب کچھ برداشت کر رہے تھے، وہ قوم اسی ناوک افگنی اور نشتر زنی میں پیش پیش تھی۔

اس کے بعد انہوں نے بتایا کہ فلاں صوبے کے مسلمانوں نے آپ کے ساتھ کیا کیا، اور فلاں علاقے کے مسلمانوں نے کیا۔ اس تفصیل کے بعد کہا کہ سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ مولوی اور مولانا حضرات بھی آپ کے پیچھے تیغ جھاڑ کر پڑ گئے۔

اس کے بعد مسٹر بھٹو نے کہا کہ ان میں ایک ایسا شخص بھی تھا جو آپ کے خلاف کہتا تو وہی کچھ تھا، لیکن کہتا تھا نسبتاً نکھری ہوئی زبان میں، میں اس کی اس زمانے کی تحریروں کے چند ایک اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

اس کے بعد انہوں نے مودودی صاحب کی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم" کے اقتباسات (انگریزی زبان میں) پڑھنے شروع کئے۔ انہوں نے کس قدر اقتباسات پیش کئے، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ یہ پاکستان ٹائمز لاہور مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۷۶ء کے پورے اڑھائی کالم میں سما سکے۔　(طلوعِ اسلام فروری ۱۹۷۷ء صفحہ ۴۴-۴۳)

تحریکِ نظامِ مصطفیٰ

ارباب فکر و نظر نے اسی زمانے میں کہہ دیا تھا کہ بھٹو (مرحوم) نے یہ بہت بڑی غلطی کی ہے، بہرحال اس کے بعد ۱۹۷۷ء میں قومی متحدہ محاذ کی طرف سے تحریک شروع کی گئی۔ نام تو اس کا تحریک نظامِ مصطفیٰ تھا، لیکن جیسا کہ میاں طفیل محمد صاحب نے حال ہی میں انکشاف فرمایا ہے۔

> وہ اتحاد صرف ایک شخص کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے تھا، جس کے بعد وہ پارہ پارہ ہو گیا۔　(روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۸۳ء)

اس کے بعد جولائی ۱۹۷۷ء میں انتقالِ اقتدار عمل میں آگیا، اور ملک کا نظم و نسق فوج نے سنبھال لیا۔

عملی اقتدار:

میں نہ عملی سیاسیات میں حصہ لیتا ہوں، نہ ہی میرا تعلق کسی سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقے سے ہے۔ اس لئے میں اس انتقالِ اقتدار کے سیاسی اسباب و وجوہ اور عواقب و مضمرات کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے ہماری مذہبی پیشوائیت کے عزائم کس طرح بر وئے کار آنے لگے۔ اس سلسلہ میں میں اتنا کہنا ہی کافی سمجھتا ہوں کہ نفاذِ اسلام کے سلسلے میں جس قدر قوانین اب تک نافذ ہوئے ہیں، وہ ان کی منشا اور مرضی کے مطابق ہیں۔ مملکت کے اقتدار کی بنیاد قانون سازی کے اختیارات پر ہوتی ہے، جس کی تائید اور منشا کے مطابق قوانین مرتب ہوں عملاً اقتدار اسی کے ہاتھ میں سمجھا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو اقتدار کا دامن ہماری مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں ہے۔ جس کے لئے وہ گذشتہ تینتیس پینتیس (۳۵) سال سے مضطرب تھے۔ قطع نظر اس کے کہ مملکت کا یہ تصورِ اسلامی

نقطۂ نگاہ سے کیا ہے۔ اس حقیقت میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ یہ تصور اس مقصد کے یکسر خلاف ہے جسے حاصل کرنے کے لئے علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا نظریہ پیش کیا تھا اور قائداعظمؒ نے اسے حاصل کر دکھایا تھا۔ جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے۔ ان دونوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ اس سے مقصد یہ ہے کہ قوم کو مولانا حضرات کے چنگل سے آزاد کرا دیا جائے۔ اور ہوا یہ کہ قوم کی نس نس ان کی گرفت میں آ چکی ہے۔ اس سے پہلے ان کے شرعی فیصلے فتوؤں کی حیثیت رکھتے تھے، کہ جس کا جی چاہے مانے، نہ چاہے نہ مانے۔ اب وہی فتوے حکومت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ ہوتے ہیں، جن میں کسی کے لئے مجالِ سخن نہیں۔

مجھے ان حضرات کے اقتدار سے بھی کچھ مخاصمت نہیں۔ میرے لئے جو چیز وجۂ صد اضطراب اور باعث ہزار پریشانی ہے، وہ یہ ہے کہ جس قسم کا اسلام یہ حضرات نافذ کر رہے ہیں، اس سے قوم کی نوجوان نسل نفسِ اسلام ہی سے برگشتہ اور متنفر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مجھے یہ ڈر ہے کہ رفتہ رفتہ یہ طبقہ کمیونزم کی گود میں نہ چلا جائے جس کے لئے وہ ہر وقت آغوش وا کئے ہے۔ میں سنہ ۱۹۴۳ء کا پاکستانی ہوں، اور گذشتہ چالیس۴۰ پینتالیس۴۵ سال سے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ قرآنی مملکت کے قیام کے لئے وقف کئے چلا آ رہا ہوں۔ آپ سوچئے کہ یہ خطرہ میرے لئے کس قدر سوہانِ روح ہو رہا ہو گا۔ کس قدر حسین تھا وہ خواب جو ہم نے دیکھا، اور کس قدر بھیانک ہو گی اس کی یہ تعبیر! خواب تو لوٹائے نہیں جا سکا کرتے۔ خدا کرے کہ اس کی یہ تعبیر دیکھنے کا وقت نہ آئے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

والسّلام

ضرورتِ رشتہ

ساہیوال (ضلع) کی ایک شریف معلّمہ، ایف اے۔ پی ٹی سی، عمر ۲۷ سال کے لئے باروزگار و موزوں رشتہ مطلوب ہے۔ اندرونِ ملک و بیرونِ ملک کی کوئی قید نہیں۔ خط و کتابت (بصیغہ راز) [م۔ ا۔ خ]

معرفت ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/ بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

باب المراسلات

عورت کی شہادت

(۱) سوال:۔ آج کل قانونِ شہادت کے مسودہ کا پھر چرچا ہو رہا ہے۔ اس میں جس انداز کے قوانین درج ہوں گے ان کے متعلق کسی پیش گوئی کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ قرآن کے خلاف ہوں گے۔ ان میں ایک یہ بھی ہو گا کہ دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر تصوّر کی جائیگی۔ اس سلسلہ میں یہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عورت ناقص الاعتبار ہے۔ اس لئے ایک عورت کی شہادت پہ اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ کیا واقعی یہ بات ہے؟

جواب:۔ ہم متعدد بار بتا چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہی نہیں کہ اگر دو مرد نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت لی جائے۔ اس نے کہا یہ ہے کہ گواہ عورت کی کوئی جاننے والی اسکے ساتھ کھڑی ہو جائے تاکہ اگر وہ (گواہ عورت) کہیں بھول جائے یا اسے کچھ الجھاؤ ہو جائے تو یہ دوسری عورت اسے صحیح بات یاد دلا دے۔ یہ دوسری عورت عدالت سے کچھ نہیں کہے گی۔ فقط گواہ عورت کو یاد دلا دے گی۔ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ جب گواہ عورت شہادت دے چکے تو پھر دوسری عورت کی گواہی قلمبند کی جائے۔ شہادت صرف ایک ہی کی ہوگی۔ اگر وہ بھولے نہیں، یا اسے کہیں الجھاؤ نہ ہو، تو پھر اس دوسری عورت کی مداخلت تک کی ضرورت نہیں ہوگی۔

لیکن اگر معترضین کا کہنا یہ ہے کہ دو عورتوں کی گواہی کا مطلب یہ ہے کہ عورت ناقص الاعتبار ہے، اس لئے ایک عورت کی گواہی قابلِ اعتماد قرار نہیں دی گئی۔ تو اس معیار (یا اصول) کی رو سے تمام مرد ناقص الاعتبار قرار پا جاتے ہیں۔ (مثلاً) قرآنِ کریم کی رُو سے وصیت کے لئے دو گواہوں کی ضرورت ہے ($\frac{5}{106}$) اسی طرح طلاق کے سلسلہ میں بھی دو گواہوں کی ضرورت ہے ($\frac{65}{2}$)۔ ان دونوں کی گواہی یکے بعد دیگرے لی جائیگی۔ جرمِ فحش کے ضمن میں چار گواہوں کی ضرورت ہو گی ($\frac{4}{15}$) اور قذف کے لئے بھی چار گواہوں کی ($\frac{24}{4}$)۔ ان سب کی گواہی یکے بعد دیگرے لی جائے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ (ان حضرات کے معیار کی رُو سے) ایک دو مرد ہی نہیں، تین تین مرد بھی ناقص الاعتبار قرار پاتے ہیں جس کی وجہ سے چوتھے مرد

کی گواہی بھی ضروری ہے۔ اگر چوتھا گواہ نہ ہو تو پہلے تینوں گواہوں کی گواہی ناقابلِ تسلیم قرار پا جائے گی۔

آپ نے غور فرمایا کہ (ایک مرد اور دو عورتوں کی صورت میں تو) دوسری عورت کی گواہی کی ضرورت ہی قرار نہیں دی گئی اور دو مرد گواہوں کی صورت میں دونوں کی اور چار کی صورت میں چاروں کی گواہی لازمی قرار دی گئی ہے۔ پوچھئے ان سے کہ (ان کے معیار کے مطابق) کون ناقص الاعتبار قرار پاتا ہے؟ مرد یا عورت؟

قرآن کریم نے جہاں جہاں بھی شہادت کا ذکر کیا ہے، کسی جگہ بھی جنس کی تخصیص نہیں کی۔ یعنی یہ نہیں کہا کہ (مثلاً) چار گواہ صرف مرد ہوں۔ ان میں عورت کوئی نہ ہو یا اگر تین مرد ہوں تو چوتھے مرد کی بجائے دو عورتیں گواہ ہوں کسی جگہ بھی ایسا نہیں کہا۔ نہ ہی یہ کہا ہے کہ اگر مرد گواہ نہ ہوں، صرف عورتیں ہی گواہ ہوں تو مقدمہ خارج، اور ملزم کو بری کر دیا جائے کیونکہ عورت کی گواہی قابلِ قبول نہیں۔ اس کے برعکس اس نے، گواہی کے معاملہ میں مرد اور عورت کو یکساں قرار دیا ہے۔ سورۃ نور میں ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی پر تہمت لگائے اور اس کے ثبوت میں کوئی گواہ نہ ہو، تو اسے چاہیئے کہ چار مرتبہ خدا کی قسم کھائے کہ الزام صحیح ہے۔ اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر خدا کی لعنت۔ اس کے جواب میں اگر عورت اس کے الزام کی تردید کرنا چاہے تو وہ بھی اسی طرح چار مرتبہ خدا کی قسم کھا کر کہے کہ الزام غلط ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اگر میں جھوٹی ہوں تو مجھ پر خدا کی لعنت۔ یوں اس کی بریت تسلیم کر لی جائیگی۔ آپ نے غور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح مرد اور عورت کو مساوی قرار دیا ہے۔

ایسا کیوں ہے؟

سوال:۔ پاکستان میں جب سے نفاذ اسلام کا سلسلہ چلا ہے، کئی احکام ایسے نافذ کئے گئے ہیں جو قرآن کریم کی نص صریح کے خلاف ہیں۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ یہ تو باور نہیں کیا جا سکتا کہ اہل الذمہ حضرات کو اس کا علم نہ ہو کہ وہ قوانین قرآن مجید کے خلاف ہیں۔ ارباب حل و عقد کے متعلق تو شاید یہ کہا جائے کہ انہیں قرآن مجید کا اتنا علم نہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ علماء کرام اور مفتیان عظام حضرات میں سے بھی کوئی ان کے خلاف آواز نہیں بلند کرتا۔ اس کی کچھ تو وجہ ہوگی!

جواب:۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ قرآن کریم نے یہودیوں اور عیسائیوں کے متعلق کہا ہے کہ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (9/31) "انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو خدا بنا رکھا ہے"۔ چنانچہ ان کے ہاں احکام ان کے فقہا کے رائج ہوتے تھے۔

یہی مسلک ہم نے اختیار کر رکھا ہے۔ ہمارے ہاں قوانین فقہ کے رائج کئے جا رہے ہیں جو ہمارے علماء اور فقہا ہی کے مرتب کردہ ہیں۔ یہ جو ہمارے ہاں اٹھتے بیٹھتے دہرایا جاتا ہے کہ ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا تو اس میں "کتاب" کا لفظ محض برائے وزنِ بیت رکھا گیا ہے۔ اگر اتفاق سے فقہ کا کوئی قانون قرآن کے مطابق ہو، تو ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ دیکھ لیجئے۔ یہاں کتاب اللہ کے مطابق قوانین نافذ ہوتے ہیں۔ اور جو قوانین قرآن مجید کے خلاف ہوں، انہیں پلٹ کر نہیں دیکھا جاتا۔ یہ حضرات ایسا کچھ کسی سازش کے تحت نہیں کرتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ فقہ اور قرآن میں اگر تضاد واقعہ ہو تو قانون فقہ کا نافذ ہوگا۔ چنانچہ فقہ حنفیہ کے مسلّم امام، ابوالحسن عبید اللہ کرخیؒ نے فرمایا ہے کہ۔

> ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا تو ماوّل ہے یا منسوخ ہے۔ اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ ماوّل یا منسوخ ہے۔
>
> (تاریخ فقہ اسلامی علامہ خضری)

یعنی قرآن کی جو آیت فقہ کے خلاف ہو، اس کی ایسی تاویل کی جائے کہ وہ فقہ کے موافق بن جائے، اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھا جائے۔ حکم بہرحال فقہ کا نافذ ہوگا۔ یہی "احبار و رہبان کو خدا بنا لینا ہے"۔ اطاعت احکام کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ اس قدر غیور واقع ہوا ہے کہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ لَا یُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (۱۸/۲۶) وہ اپنے حق حکومت میں کسی کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔ لہٰذا اطاعت خالص احکام قرآنی کی ہوگی۔ لیکن یہاں صورت یہ ہے کہ خالص قرآن کے احکام کو سند قرار دینے کو غلطی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ سیّد ابوالاعلیٰ (مرحوم) نے جب علامہ اسلم جیراجپوریؒ کے ساتھ مسئلہ غلامی پر بحث کی تو کہا کہ:

> مؤلف کی غلطی کا اصل سبب یہ ہے کہ انہوں نے صرف قرآن سے غلامی کا قانون اخذ کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔
>
> (تفہیمات۔ حصہ دوم۔ صفحہ ۲۹۲۔ بحوالہ کتابچہ غلام اور لونڈیاں صفحہ ۱۰۶)

اور اس "غلطی کے مرتکبین" کے متعلق فرمایا کہ:

> یہ سب ٹیڑھے ذہن کے لوگ اور خبطی ہیں۔ (ترجمان القرآن بابت جون جولائی ۱۹۵۲)
>
> (بحوالہ پمفلٹ۔ یتیم پوتے کی وراثت صفحہ ۶۴)

کیا اس کے بعد یہ پوچھنے کی ضرورت باقی رہتی ہے کہ یہاں خلافِ قرآن احکام کیوں نافذ ہوتے ہیں؟ یہاں کھلے بندوں شرک کا ارتکاب ہو رہا ہے اور اس کے خلاف کوئی لب تک نہیں ہلاتا۔ خدا شاہد ہے۔ ہمیں تو اس کی غیرت سے ڈر لگتا ہے۔ اس نے شرک کو ظلم عظیم کہا ہے۔ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان

کے وضع کردہ خلافِ قرآن قوانین کو الوہیاتی درجہ دے دیا جائے۔

۲۔ غلامِ پختہ کارے شو!

سوال:۔ دسمبر کی آخری شب (۳۱ ۱۲/۸۲) کو لاہور ٹیلی ویژن سے ایک مذاکرہ نشر ہوا جس کا موضوع تھا "علامہ اقبالؒ اور مغربی جمہوریت"۔ میزبان منیرالدین چغتائی تھے۔ اور شرکاءِ محفل میں محترم رفیق احمد باجوہ، گوجرانوالہ کے مسعود صاحب اور فیصل آباد کے محترم بتول الزبیا محترم باجوہ صاحب کی زبانی یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی کہ اسلام میں قانون سازی کا حق کسی انسان کو حاصل نہیں، حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ لیکن اس کے سامنے ہی ایک دوسرے صاحب نے جمہوریت کی تردید کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ کا یہ شعر پڑھا کہ ؎

گریز از طرزِ جمہوری، غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

مغربی جمہوریت بے شک خلافِ اسلام ہے لیکن اسے چھوڑ کر "غلامِ پختہ کارے" کا مسلک کسطرح اسلام کے مطابق ہو سکتا ہے! اس معمہ کو حل فرما دیجئے۔

جواب:۔ "غلامِ پختہ کارے شو" کا مسلک تو مغربی جمہوریت سے بھی بڑھ کر خلافِ اسلام ہے یہ تو کھلی ہوئی ملوکیت یا آمریت ہے۔ قرآن کی رُو سے عبدیت (غلامی) صرف خدا کی جائز ہے کسی انسان کی نہیں خواہ وہ کیسا ہی "پختہ کار" کیوں نہ ہو۔ عام پختہ کار انسان تو ایک طرف، خدا تو رسول کی عبدیت کو بھی جائز قرار نہیں دیتا۔ اس کا واضح ارشاد ہے کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ... (۳/۷۹) "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اس کے پاس ضابطۂ قوانین ہو۔ خواہ اختیار ہو۔ اور خواہ اسے نبوت ہی کیوں نہ عطا ہوئی ہو۔ ... کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں میرے غلام بن جاؤ"۔ غلامی صرف خدا کی جائز ہے۔ اس عظیم بنیادی حقیقت کی بار بار یاد دہانی کے لئے، ہمارے کلمہ میں لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کے ساتھ، مُحَمَّدٌ عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ کا لاینفک لاحقہ رکھ دیا گیا ہے۔ یعنی اس امر کا اقرار اور اعلان کہ عبدیت صرف اللہ کی جائز ہے۔ اور تو اور نبی اکرمؐ (محمدؐ) بھی خدا کے رسول اور اس کے عبد ہیں۔ جب رسول اللہؐ کی عبدیت بھی جائز نہیں تو کسی اور "پختہ کار" کی کیا حیثیت ہے کہ اس کی غلامی اختیار کی جائے۔

باقی رہے علامہ اقبالؒ سو وہ لاکھ اعلان کرتے رہے کہ میں شاعر نہیں، لیکن شاعری، انسان کے تحت الشعور میں اس طرح حلول کر جاتی ہے کہ اس کے متعلق معلوم تک نہیں ہونے پاتا کہ وہ کہاں سے سر ابھار لیتی ہے۔ حضرت علامہ ساری عمر خدا کی غلامی اور محکومی کی تلقین کرتے رہے ——— سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے ——— ان کی فکر کا اوڑھنا اور بچھونا تھا۔ لیکن مضمون آفرینی کے جذبہ میں گم ہو کر "غلامِ پختہ کارے" کہہ گئے اور اس کا

احساس نہ ہوا کہ ان کا یہ سہو کتنے لوگوں کے لئے گمراہی کا موجب بن سکتا ہے ـــــ بہر حال یہ ان کی ستم ظریفی ہی تھی۔

ہم نے بھی اتفاق سے، ۱۰ دسمبر کی شب کا محولہ بالا مذاکرہ سنا تھا۔ ہم محترم باجوہ صاحب کو، ہزار پابندیوں کے باوجود، اس حق گوئی پر مستحق تبریک و تہنیت سمجھتے ہیں اور لاہور ٹیلی ویژن کو خوش نصیب کہ اتفاقیہ ہی سہی، اس کے حلقوم سے بھی حق کی آواز نکلی۔ ہمیں امید ہے کہ اُسے اس پر سجدۂ سہو نکالنا نہیں پڑا ہوگا!

---

(۴) مولانا عبدالستار خان نیازی کا آئینی فارمولا:

قارئین طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب کا (پرویز صاحب کے نام) حسب ذیل خط ملاحظہ فرمائیے:

"روزنامہ جنگ لاہور اشاعت ۲۳ $\frac{12}{84}$ کے صفحہ ۳ پر (مولانا) عبدالستار خان نیازی کا آئینی فارمولا شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں دو پیرے تحریر خدمت ہیں۔ آپ کے لئے اس امید پر کہ آپ یہ تمام مضمون خود پڑھیں، اور ہم جیسے سیدھے سادھے مسلمانوں کے لئے قرآن کی روشنی میں جواب عنایت فرما دیں۔ یہ تو میری رندانہ جرأت ہوگی، کہ عرض کروں کہ آپ اس مضمون کو مختلف اخبارات میں شائع کرائیں تاکہ مسلمان دگرگوں ہوتا نہ رہے۔ آپ نے اس کے متعلق بڑی جرأت اور حقائق کے ساتھ تصوف کی حقیقت میں وضاحت فرمائی ہے۔ جس درد اور محبت سے آپ نے یہ کتاب لکھی ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ خدا کرے زورِ قلم ہو اور زیادہ۔ پیراجات ذیل خدمت ہیں:۔

۱۔ صفحہ ۳ کالم نمبر ۱:۔ "عام انسان چونکہ خود غیب نہیں جان سکتا لہٰذا اس کے لئے غیب کو ماننے کی صورت بھی صرف یہ ہے کہ اللہ نبیؑ پر وحی (REVELATION) سے۔ ولی پر الہام (INTUITION) سے۔ اور اپنے نیک بندوں پر القاء (INSTINCT) سے حسب مدارج کم و بیش غیب ظاہر کر دیتا ہے۔ عام انسان جس پر نہ وحی ہوتی ہے، نہ الہام اور نہ القاء، اپنے ظاہری علم سے نبی، ولی یا نیک انسانوں کی بشری علامتیں دریافت کرکے ان کا مرتبہ شناخت کر لیتے ہیں۔ یہ ہستیاں غیب کی جو نوعیت بیان کرتی ہیں عام انسان ان کے مرتبہ کی شناخت کے بھروسہ پر اس پر ایمان لے آتا ہے۔"

۲۔ صفحہ نمبر ۳ کالم نمبر ۲:۔ "پس اندریں حالات لازم ہے، کہ آئینی فکر کے متداول مضامین میں سے چند ایک کو منتخب کر لیا جائے، اور ہر عنوان کے ماتحت اسلامی آئین کی خصوصیات ملاحظہ کر لی جائیں۔ ان خصوصیات میں سے ایک مشترکہ خاصا انسانی معاملات میں

ربّانی ایجنسی کی براہِ راست مداخلت بذریعہ ملائکہ، انبیاء اور اولیاء اللہ کا طے شدہ مفروضہ بھی ہے۔

فاضل مضمون نگار کا مضمون مکمل شائع نہیں ہوا ہے۔ دوسری قسط آنے پر معلوم ہو جائیے گا کہ وہ کہاں کہاں غوطہ زن ہوتے ہیں۔

آپ سے پھر بھی دردمندانہ اپیل کرتا ہوں، کہ ان فتنوں سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے مضامین اخبارات میں شائع کراتے رہیں۔ آپ کی کتب تک بہت ہی کم لوگوں کی پہنچ ہے۔ اور یہی صورت رسالہ طلوعِ اسلام کی بھی ہے۔ اخبارات عام لوگوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ اور ان جیسے لوگوں کے مضامین ہر روز شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جب تک حقائق سامنے نہ آئیں لوگ انہی پر اعتماد کرتے رہیں گے۔"

طلوعِ اسلام

نیازی صاحب کا آئینی فارمولا اخبار جنگ (لاہور) کی چار اشاعتوں میں شائع ہوا ہے جسے ہم نے دیکھ لیا ہے ہم ان میں سے صرف اسی حصہ کے متعلق گفتگو کریں گے جس کا ذکر محترم مکتوب نگار نے اپنے گرامی نامہ میں کیا ہے۔

۱۔ آج تک دساتیر یا ان کے مسودات میں امورِ مملکت اور مآخذ قوانین سے متعلق بحث ہوا کرتی تھی، محترم نیازی صاحب نے ایک نئی طرح ڈالی ہے اور عقائد کو بھی دستور کا حصہ قرار دے دیا ہے۔ ملک کے مذہبی حلقوں میں احکامات کے سلسلہ میں پہلے ہی کچھ کم اختلافات نہیں۔ اگر اعتقادات کو بھی دستور کا جزو قرار دے دیا گیا ہے، تو آپ سوچ لیجئے کہ اس سے اختلافات کس حد تک شدت اختیار نہیں کر جائیں گے۔ مذہبی اختلافات کا نتیجہ ہے کہ ملک کے لئے کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا۔ اعتقادات کو درمیان میں لائیے تو کوئی دستور بھی مرتب نہیں ہو سکے گا۔

(۲) یہ اعتقادات نیازی صاحب (یا یوں کہیے کہ فرقہ بریلویہ) کے ہیں جس سے نیازی صاحب منسلک ہیں۔ یہ ایک عرصہ سے، دوسرے فرقوں کے ساتھ، مناظروں اور مباحثوں کا موضوع بنے چلے آ رہے ہیں۔ طلوعِ اسلام کے صفحات اس بحث کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ یہ بڑی تفصیل چاہتی ہے۔ ہم صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ قرآنِ مجید کی رو سے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضراتِ انبیاء کرام کو بذریعہ وحی، غیب کا کچھ علم عطا ہو جاتا تھا۔ اولیاء کرام یا دیگر نیک بندوں کی طرف الہام یا (INSTINCT)[1] کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں۔ نہ ہی انہیں علمِ غیب

[1] (INSTINCT) حیوانی سطحِ زندگی تک محدود ہے۔ انسان کو یہ بھی حاصل نہیں، چہ جائیکہ یہ علمِ غیب کا ذریعہ بن سکے! اور (INTUITION) کو علمِ غیب کا ذریعہ قرار دینا بھی غلط ہے۔ یہ برگساں کی فلسفہ کی مشہور اصطلاح ہے جس کے مدعی ملحد و بیدین بھی ہوتے ہیں۔

عطا ہونے کا اشارہ تک۔ یہ خاصۂ انبیاء تھا جس کا سلسلہ ختمِ نبوت کے ساتھ ختم ہوگیا۔ اس قسم کے عقائد قرآن کی نصوصِ صریحہ کے خلاف ہیں۔ پرویز صاحب کی کتاب "من ویزداں" اور "تصوف کی حقیقت" میں انکے متعلق تفصیلی بحث آچکی ہے۔ انبیاء اور اولیاء کا انسانی معاملات میں مداخلت کا عقیدہ بھی خلافِ قرآن ہے

(۳) جہاں تک ان مضامین کے اخبارات میں شائع ہونے کا تعلق ہے، سو محترم مکتوب نگار کو غالباً اس کا علم نہیں کہ پرویز صاحب یا طلوعِ اسلام پر ملک کے اخبارات کے دروازے بند ہیں اگر کوئی ایسا مضمون ہو جو ان کی مصلحت کے مطابق ہو تو اسے تو وہ (کبھی کبھار) اپنے ہاں شائع کردیتے ہیں، ورنہ ان کی دربندی کا یہ عالم ہے کہ طلوعِ اسلام کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی تقاریب (مثل عید میلاد النبیؐ، اقبال ڈے، یوم قائد اعظمؒ وغیرہ) کے اعلانات تک اپنے ہاں شائع نہیں کرتے، حتیٰ کہ اکثر اخبارات پرویز صاحب کے ہفتہ وار درسِ قرآن مجید کے اعلانات تک شائع کرنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ اگر ہمارے اخبارات، قرآن کریم کے پیغام کی نشر و اشاعت میں ہم سے تعاون کرتے، تو آج اس ملک کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ طلوعِ اسلام کی قرآنی نشید حیات پر در جس طرح آج سے پینتیس (۳۵) سال پہلے تنہا تھی اسی طرح آج بھی محروم ہمنوا ہے۔ یہ توحق کی آواز کی اندرونی قوت ہے جس کی بناء پر یہ ان پابندیوں کے باوجود پھیلتی چلی جارہی ہے، ورنہ ہمارے معاشرہ نے اس کا گلا گھونٹنے میں تو کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اور یہ سب مذہبی پیشوائیت کے تصدق ہے۔

۴۔ اسلامی انقلاب کا سیاسی طریق

سوال:۔ جماعتِ اسلامی کے نقیب، ماہنامہ ترجمان القرآن (بابت اکتوبر ۱۹۸۳ء) میں (کالعدم) جماعتِ اسلامی کے ایک ممتاز رکن سید اسعد گیلانی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "سید مودودی کی سیاسی فکر کے سولہ نکات"۔ اس کا آخری نکتہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

> مولانا مودودی اسلامی انقلاب کے زبردست داعی ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب "اسلامی حکومت کسطرح قائم ہوتی ہے" میں ان کا طریق کار بیان کیا ہے۔ یہ خالص ایک نظریاتی جدوجہد ہے۔ اس کے لئے انقلابی طریقہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے، جیسے رسول اکرمؐ نے اختیار فرمایا تھا۔ لیکن یہ کفار کے مقابلے ہی میں ممکن ہوسکتا ہے۔ اس انقلاب کے لئے جمہوری طریق بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ جمہوری طریقہ میں انتخابات بھی شامل ہیں جو صرف مسلمان معاشروں میں ہی ممکن ہیں۔ یہ طریقہ پاکستان میں جماعتِ اسلامی آزماتی چلی آرہی ہے۔ تیسرا طریق مقبولِ عام عوامی انقلابی تحریک ہے۔ اس کے ذریعے بھی سیاسی اقتدار پر قبضہ کرنا جائز اور درست ہے جیسے ایران میں بہت کامیابی کے ساتھ آزمایا گیا ہے۔ مسلمان ممالک میں عوام کی

پشت پناہی اور مؤثر جاندار قیادت کے بل پر یہ طریقہ بہت مؤثر اور نتیجہ خیز ثابت ہوسکتا ہے اور اسے جا بجا آزمایا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے با اصول جرأت مند اور مقبولِ عام قیادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مولانا مودودیؒ نے ان تینوں طریقوں کو اسلامی قرار دیا ہے۔

ہم تو سمجھتے تھے کہ مودودی مرحوم صرف انتخاب کے ذریعے انتقالِ اقتدار کے قائل تھے لیکن گیلانی صاحب کے اس انکشاف نے نگاہ کا رخ کسی اور طرف پھیر دیا ہے۔ چونکہ آپ نے مرحوم مودودی صاحب اور ان کی تحریک کا مسلسل اور بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا ہے، آپ فرمائیں گے کہ اس جماعت کے پیشِ نظر انتقالِ اقتدار کا اور کون سا طریقہ ہے؟

جواب:۔ آپ نے مرحوم مودودی صاحب کے خیالات اور ان کی تحریک کا وسعتِ نظر کے ساتھ مطالعہ نہیں کیا جو آپ اس خیال میں ہیں کہ ان کے نزدیک انتقالِ اقتدار کا طریقہ صرف انتخابات ہیں۔ ان کے ہاں اور طریقے بھی ہیں۔ اس کی تفصیل کسی اور وقت پیش کی جائیگی

۵۔ اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے؟

قارئین طلوعِ اسلام میں سے ایک "دل فگار" محترمہ کا خط ملاحظہ فرمائیے۔

آج (۱۰ جنوری ۱۹۸۴ء کو) لاہور ٹیلی ویژن پر ایک ڈرامہ دکھایا گیا جس کا عنوان تھا..... چھپن چھپائی۔ ڈرامہ کی کہانی کے خط و خال یوں تھے:۔

(۱) ایک شوہر نامدار اپنی بیوی کو اس جرم کی بناء پر طلاق دے دیتے ہیں کہ ڈاکٹروں نے تصدیق کر دی ہے کہ اس کے ہاں اولاد نہیں ہوگی۔

(۲) وہ اپنے طلاق نامہ میں تین مرتبہ طلاق، طلاق، طلاق لکھ دیتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اب یہ میاں بیوی آپس میں شادی نہیں کر سکتے۔

(۳) بیوی افسردہ و رنجیدہ ہوتی ہے تو میاں صاحب یہ کہہ کر اس کی تسلی کر دیتے ہیں کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اس طلاق کے باوجود ہماری آپس میں شادی ہوسکتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ مناسب موقعہ پر وہ کسی اور مرد کے ساتھ شادی کر کے اس سے طلاق حاصل کر لے۔ اس طرح شریعت کی رُو سے دوبارہ شادی کر لینے کی اجازت ہوگی۔

(۴) عورت ایک نکھٹو مرد سے، اسی مقصد کے لئے شادی کر لیتی ہے لیکن وہ اسے طلاق نہیں دیتا۔ اس سے طلاق لینے کے لئے اسے جسقدر تنگ اور مجبور کیا جاتا ہے، اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے یہ طریقِ طلاق، اور دوبارہ شادی کرنے کا یہ حیلہ، اسلام

کے بھی خلاف ہے اور ملک میں رائج قوانین کے بھی خلاف۔ اس ڈرامے کا مقصد دنیا میں اسلام کی تضحیک اور عورت (بیچاری) کی تذلیل کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ اب تک تو اس قسم کے فتوے علماء حضرات کی طرف سے نجی طور پر صادر ہوا کرتے تھے، لیکن اب ان کی تشہیر خود حکومت کے ذرائع ابلاغ سے بھی ہونے لگی! دنیا اس قسم کے اسلام کے متعلق کیا کہے گی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا؟

طلوعِ اسلام

ہم نے ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر کم ہی تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ ایک تو اس لئے کہ ——— سینہ تمام داغ داغ، پنبہ کجا کجا نہم ——— اور دوسرے اس لئے کہ سرکاری ریڈیو یا ٹیلی ویژن اس پالیسی کے بروئے کار لانے کے لئے مجبور ہوتے ہیں جو ان کے لئے وضع کر دی جاتی ہے، لہٰذا انہیں موردِ الزام کیا ٹھہرایا جائے۔ لیکن جیسا کہ اس (انتہائی دُکھ بھرے دل سے لکھے ہوئے) خط میں کہا گیا ہے اس سے دنیا میں اسلام کا جس قدر مذاق اڑے گا، اس سے ہم اسے شائع کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ صورت یہ ہے کہ،

(۱) جس طریق سے اس ڈرامہ میں طلاق دی گئی ہے، وہ طریق قرآن مجید کی نص صریح کے بھی خلاف ہے، اور ملک میں رائج عائلی قوانین کے بھی خلاف۔ (طلاق کے صحیح طریق کے متعلق طلوعِ اسلام میں متعدد بار لکھا جا چکا ہے)۔

(۲) مرد نے طلاق دینے کی جو وجہ بتائی ہے ——— یعنی یہ کہ بیوی کے ہاں اولاد نہیں ہوتی، اس سے عورت کی حیثیت بچے پیدا کرنے کی مشین کی سی ہو کر رہ جاتی ہے کہ جب مشین وہ مقصد پورا نہ کرے جس کے لئے اسے بنایا گیا ہے، اس کی جگہ دوسری مشین لے آیئے! قرآن کی رُو سے نکاح، باہمی مودّت، رحمت اور سکینت (۳۰/۲۱) کے ساتھ رفاقت کا معاہدہ ہے۔

(۳) شوہر نے طلاق دینے کے ساتھ ہی، دوبارہ نکاح کرنے کا جو راستہ تجویز کیا ہے۔ اسے حلالہ کہتے ہیں، جو (بجز) قرآن کریم اور رائج الوقت قانون کے خلاف ہونے کے ساتھ انتہائی حیا سوز اور شرمناک بھی ہے۔ چنانچہ حضور نبی کریمؐ کی ایک حدیث ہے:۔

(حضرت) عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول (صلعم) نے حلالہ کرنے والے اور حلالہ کرانے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ (مشکوٰۃ، باب خلع و طلاق)

اس قسم کی طلاق اور اس قسم کے ملعون حلالہ کو ہمارا ٹیلی ویژن دنیا کے سامنے اسلامی شعار کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے! یہی وہ اسباب و ذرائع ہیں جن سے ہمارا نوجوان طبقہ اسلام سے متنفر، اور اسلام دنیا میں بدنام ہو رہا ہے۔

ادارۂ طلوعِ اسلام کی

مطبوعات کی قیمتیں

(فروری ۱۹۸۴ء)

نوٹ:۔ ان قیمتوں میں ڈاک اور پیکنگ کا خرچ شامل نہیں۔

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ کھلے پارے)	روپے ۱۵۰/-	جوئے نور	روپے ۳۵/-
پارہ نمبر ۱ تا ۳۰ (فی پارہ)	۶/-	شعلۂ مستور	۳۵/-
پارہ نمبر ۲ تا ۲۹ (〃)	۵/-	جہانِ فردا	۳۵/-
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ۔ مجلد)	۱۸۰/-	کتاب التقدیر	۳۵/-
(تینوں جلدوں میں) فی جلد	۹۰/-	معراجِ انسانیت	۶۰/-
لغات القرآن (مکمل سیٹ۔ مجلد)	۲۰۰/-	شاہکارِ رسالت (تازہ ایڈیشن)	۷۵/-
(چاروں جلدوں میں) فی جلد	۵۰/-	اقبالؒ اور قرآن	۳۵/-
مطالب الفرقان (جلد اول)	۷۵/-	انسان نے کیا سوچا؟	۷۵/-
مطالب الفرقان (جلد دوم) (تازہ ایڈیشن)	۷۵/-	مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں	۱۵/-
مطالب الفرقان (جلد سوم)	۷۵/-	حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ (اعلیٰ ایڈیشن)	۱۰/-
مطالب الفرقان (جلد چہارم)	۹۰/-	ابلیس و آدم (تازہ ایڈیشن)	۷۵/-
مطالب الفرقان (جلد پنجم)	۷۵/-	ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION	
تصوف کی حقیقت	۷۵/-		
نظامِ ربوبیت (جدید ایڈیشن)	۶۰/-	مجلد (H-B)	۷۵/-
قرآنی قوانین (جدید ایڈیشن)	۲۵/-	سلیم کے نام خطوط (جلد اول، دوم، سوم) (مکمل سیٹ)	۷۵/-
اسلام کیا ہے (تازہ ایڈیشن)	۴۵/-		

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
طاہرہ کے نام خطوط	۱۰/- روپے	حسب ذیل کتب کے سابقہ ایڈیشن ختم ہو چکے ہیں تازہ ایڈیشن چھپنے پہ اعلان کیا جائے گا۔ من و یزداں، برق طور، جہاد سلسبیل، ختم نبوت اور تحریک احمدیت، بہار نو، الفتنۃ الکبریٰ، تبویب القرآن، فردوس گم گشتہ، عربی خود سیکھئے، پاکستان کا معمار اول	
مقام حدیث	۱۰/-		
اسلامی معاشرت	۶/-		
قرآنی فیصلے (مکمل ۵ جلدیں)	۶۵/-		
(پہلی تین جلدیں، ہر جلد -/۱۰ روپے)			
(چہارم جلد -/۱۵ روپے، جلد پنجم -/۲۰ روپے)		تصنیفات (انگریزی) ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب	روپے
اسباب زوال امت	۵/-	PHENOMENA OF NATURE & QURAN (H-B)	۷۵/-
فجر الاسلام (مکمل دو جلدیں، فی جلد -/۸)	۱۶/-	CONSPIRACIES AGAINST QURAN (H-B)	۹۰/-
منزل بہ منزل	۱۵/-		
پرنسپل آف لا میکنگ اِن اسلام (انگریزی)	۵/-	FOOD AND HYGIENE IN ISLAM (P-B)	۸/-
قائد اعظمؒ اور طلوع اسلام	۲/-	THE HEAVENS THE EARTH AND THE QURAN	۷۵/-
تاریخ الامت (مکمل سیٹ ۸ جلدیں)	۴۰/-		

ماہنامہ طلوع اسلام کا سالانہ چندہ

اندرون ملک پاکستان -/۴۸ روپے

غیر ممالک بذریعہ بحری ڈاک = -/۹۸ روپے

غیر ممالک بذریعہ ہوائی ڈاک :-

(i) خلیجی اور عرب ممالک (ایران، عراق، عرب امارات، کویت، سعودی عرب وغیرہ) = -/۱۲۸ روپے

(ii) انڈیا، برما، سری لنکا، جزائر مالدیپ وغیرہ = -/۱۳۳ روپے

(iii) افریقہ کے ممالک (لیبیا، کینیا، یوگنڈا، مصر، جنوبی افریقہ) = -/۱۴۳ روپے

(iv) یورپ کے ممالک (برطانیہ، فرانس، ناروے وغیرہ) = -/۱۴۸ روپے

(v) بنگلہ دیش، نیپال، سنگاپور، ملائیشیا، جاپان وغیرہ = -/۱۴۸ روپے

(vi) نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، جزائر فجی وغیرہ = -/۹۳ روپے

(vii) امریکہ، کینیڈا وغیرہ = -/۲۰۸ روپے

مذکورہ بالا چندہ میں خرچ ڈاک شامل ہے، البتہ جو خریدار پرچہ بذریعہ رجسٹری منگوانا چاہیں انہیں فیس رجسٹری (-/۳ روپے فی پرچہ) الگ ادا کرنا ہوگا۔

نوٹ:۔ ماہنامہ طلوع اسلام کے لئے صرف، ادارہ طلوع اسلام کو لکھئے۔

کتابیں ملنے کے پتے { (۱) ادارہ طلوع اسلام ۲۵-بی، گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش، چوک اردو بازار لاہور

سربستہ حقیقتیں بے نقاب — اسرار و رموز واشگاف

پرویز صاحب متعارف تو مفکرِ قرآن کی حیثیت سے ہیں، لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ کون کونسی ہوش رُبا وادیوں اور حیرت فروش منزلوں سے گذر کر اس چشمۂ نورِ حیات تک پہنچے ہیں۔ ان کا بچپن، تصوف کے خواب آور گہوارہ میں گذرا۔ جب ان کے شعور نے آنکھ کھولی تو ان کے دل میں خلش پیدا ہوئی کہ معلوم کیا جائے کہ تصوف کی اصل و بنیاد کیا ہے۔ جسے مشاہدۂ حقیقت کہا جاتا ہے اس کی کنہ و ماہیت کیا ہے۔ وارداتِ قلبی کا سرچشمہ کونسا ہے۔ مختلف ریاضتوں اور مراقبوں سے جو روحانیت حاصل ہوتی ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ تعویذوں اور گنڈوں میں اثر کیسے پیدا ہوتا ہے۔ کرامات کس طرح سرزد ہوتی ہیں، یہ، اور اسی قسم کے سینکڑوں سوالات ان کے سینے میں اُبھرے جن کے حل کی تلاش میں وہ برسوں صوفیائے کرام کی درگاہوں اور خانقاہوں۔ ہندو سادھوؤں کی سمادھیوں اور سنیاسیوں کے یوگ آشرموں میں سرگرداں رہے اور اس طرح جو کچھ پڑھا تھا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جو کچھ سنا تھا اس کا ذاتی مشاہدہ کر لیا۔ ان واردات و مکاشفات کا علم و تجربہ حاصل کرنے کے بعد وہ دانشِ نورانی (کتاب اللہ) کے سنگِ آستاں پر سجدہ ریز ہوئے۔

اب انہوں نے اپنی ان آستاں نوردیوں اور خانقاہ پیمائیوں کی سرگذشت اور خود تصوف کی تاریخ کو اپنے مخصوص دلآویز انداز میں، اپنی اہم تصنیف

تصوّف کی حقیقت

میں منضبط کر دیا ہے۔ اس کے دو باب ہیں — اوّل، تصوف اور اسلام — دوم، تصوّف اور اقبالؒ — مستور حقیقتوں کا آئینہ، اور سربستہ رموز و اسرار کا گنجینہ — کتابت، طباعت کاغذ عمدہ — جلد مزیّن اور مطلّا — ضخامت چار سو صفحات سے زائد قیمت ۷۵/- روپے

(محصول ڈاک ۱۵/- ")

ملنے کا پتہ:

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور ۱۱ (۲) مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور